فان اعتزلوكم فلم يقاتلوكم والقوا اليكم السلم فما جعل الله لكم عليهم سبيلا

پس اگر وہ تم سے (اور تمہارے دین سے) کنارہ کش ہو گئے پر امن رہے اور صلح و سلامتی کا پیغام بھی بھیج بیٹھے تو پھر خدا نے تمہارے لئے گنجائش نہیں رکھی کہ تم انہیں چھیڑو — نساء ۹۰

قتلِ مرتد کی شرعی حیثیت

قرآن کی عطا کردہ حریت فکر کی روشنی میں احادیث و آثار کا بے لاگ جائزہ
اسلام میں قتل مرتد کے موضوع پر انقلاب آفرین تحقیق

جس میں

فقہاء اور محدثین کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ پر امن ارتداد کبھی قابل تعزیر نہیں رہا

(تحقیق و ریسرچ کا بے نظیر مرقع)

رحمت اللہ طارق

ادارہ ◆ احیائے اسلامیہ ◆ ملتان
پاک گیٹ حسن آباد بازار

مصنف ــــــ رحمت اللہ طارق

ناشران ــــــ احمد کامران و محمد رضوان نگسی

سنِ اشاعت ــــــ طبع اول۔ نومبر 1959ء

ــــــ طبع دوم۔ اکتوبر 1973ء

ــــــ طبع سوم۔ مارچ 1987ء

ــــــ طبع چہارم۔ نومبر 2001ء

ــــــ (مع اضافات جدیدہ)

مطبع ــــــ نیر اسد پرنٹرز لاہور

قیمت ــــــ مجلد -/75 روپے۔ پیپر بیک -/60 روپے

عنوان
1. ادارہ "ادبیاتِ اسلامیہ" پاک گیٹ صرافہ بازار۔ ملتان
2. محلہ بھیدی سرائے چاہ نائی والا 1339/3 نگسی منزل
بیرون پاک گیٹ ملتان شہر

انتساب

رسولِ رحمت، معلّمِ انسانیت

☆

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے حضور

- جو تھیا کریسی کی تاریک رات میں حرّیتِ فکر کی صبح درخشاں بن کر تشریف لائے
- جنھوں نے عقیدے کی اساس پر انسان اور انسانوں کے درمیان ہر قسم کی تفریق کو باطل قرار دیا۔ اور ایک انسان کو دوسرے انسان کے ریاستی اور مذہبی جبر سے نجات دلانے کے لئے اللہ کی غیر جانبدارانہ حاکمیت کا احساس دلایا
- جنھوں نے ہدایت و گمراہی کے راستے الگ کر دکھائے اور فرمایا کہ ردّ و قبول کا ہر فردِ بشر کو اختیار ہے یہاں نہ جبر ہے نہ اکراہ
- جنھوں نے حق و باطل کی آویزش میں "پوتر" اور "ملیچھ" کے انسانیت شکن امتیاز کو خارج آدابِ انسانیت قرار دے کر افرادِ بشر کو آزادانہ غور و فکر کی اساس مہیا کی اور
- جن کی اہم ترین صفت ہے

ہ انسانوں سے (مُردہ اور فرسودہ رسومات کا) بوجھ اُتارتے اور بیڑیوں یعنی سماج کے ظالمانہ بندھن اور سیاست و مذہب کے جابرانہ قوانین سے نجات دلاتے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

بگشائے درے کہ درگشایندہ توئی

بنمائے رہے کہ رہ نمایندہ توئی

من دست بہیچ دستگیرے ندہم

کایشاں ہمہ فانی اند و پایندہ توئی

(عمر خیام)

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محشرستانِ شریعت

اسلام کی مذہبی تاریخ میں جس فکری اور عملی انتشار کا سراغ ملتا ہے۔ اس کے پس منظر میں بہت سے ایسے ہاتھ کارفرما تھے جن کی واضح طور پر نشاندہی نہیں کی جا سکی ـــــ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نومسلم عربوں میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو مذہب کے "ظواہر" کو تحفظ دینے کے لئے اجبار و تشدد کا قائل تھا کیونکہ اُن کے نزدیک مذہب کے "ظواہر" کی پابندی کرنا ہی "سچی مذہبیت" کا آئینہ دار تھی۔ آگے چل کر اس تحت الشعوری خیال نے واضح اور شعوری حیثیت اختیار کر لی کہ ہو نہ ہو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ۔ لوگوں کو علم و بصیرت کی روشنی میں سوچنے اور اسی ہی بنا پر اپنے خیالات میں کلی یا جزوی تبدیلی پیدا کرنے سے روک دیا جائے۔

رفتہ رفتہ اس خیال اور نظریے نے متشدد طبقے کو دوسرے لوگوں کے

عقائد کا اپنے جی سے تعین کرنے پر اکسایا اور اسی ہی بنا پر ایک طبقہ صالحین کا اور دوسرا منکرین اور مرتدین کا وجود میں آکر پوری امتِ اسلام کو فرقہ بندی کی گہری کھڈ میں دھکیل دینے کا موجب بنا۔ یہاں پہنچ کر "مرتد" کے مفہوم کو خوابِ پریشان کی طرح اتنی وسعت دی گئی کہ اس کا حقیقی مفہوم کسی پر بھی واضح نہ ہوسکا۔ حالانکہ اگر اس کی "ہمہ گرفت" ہی کو حقیقت تسلیم کر لیا جائے تو کوئی ایک عالم بھی کسی دوسرے عالم کے نقطۂ نظر سے اپنی ذات کو "ارتداد" اور کفر کی زد سے نہیں بچا سکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ "ارتداد" یا اس کے نتیجہ میں "قتلِ مرتد" کا مسئلہ جذباتی سے زیادہ "سیاسی" اور مشروط حیثیت رکھتا ہے۔ اِسے قانونی اور تعزیری دائرے میں کھینچ لانا سراسر حماقت ہے۔ درسِ نظامی کے دانشوروں نے بہت سے علمی مراحل طے کرنے کے باوصف اس پر غور نہیں فرمایا کہ اِن کا نظریہ "قتلِ مرتد" اسلام کی ان بنیادی تعلیمات کا جو "احترام" ادیان پر مشتمل ہیں صریح نفی کرتے ہوئے حقارت کی آئیڈیالوجی کو فروغ دیتا ہے جس سے نہ صرف اسلام کی "رسوائی" کے پٹ کھل جاتے ہیں اس کی نشر و اشاعت میں ناقابلِ تسخیر رکاوٹوں کا سلسلہ بھی کھڑا ہو سکتا ہے ـــــ امن و سلامتی اور حریتِ رائے اسلام کا روشن ماٹو ہے وہ نسلی یا گروہی فلسفہ کو رد کرتے ہوئے اپنی توانائیوں کو عقل و بصیرت اور آخر میں دولتِ اطمینان کے حصول پر مرکوز کرتا ہے۔ "قتلِ مرتد" جیسے خالص "سیاسی" نوعیت کے نظریات سے اس کی بے پایاں توانائیوں کو فنا کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاسکتا۔

یہ نظریہ اگرچہ "سیاسی" اور گروہی بنیادوں پر ظہور پذیر ہوا تھا تاہم اس

کے تہ منظر سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ایمان کی بالیدگی اور اخلاق کی توانائیوں سے جب محروم ہونے لگا، روحانی اقدار ماند پڑ گئیں اور تبلیغی آداب و اخلاقیات کا شعور مرجھا گیا تو اُسے تحفظِ مذہب کی فکر شدت سے دامن گیر ہونے لگی۔ وہ دولتِ یقین سے چونکہ تہی دست ہو چکا تھا لہٰذا اپنی ہمنوا سوسائٹی کو جس حالت میں پایا قابو رکھنے کے لئے "تشدد" اجبار اور گروہی شعور کی سلاخوں میں پابند رکھنا ضروری سمجھا۔ اِس ابتدائی دفاعی شعور نے آگے چل کر حقیقت میں بھی ایک فرضی مگر دفاعی حصار کا روپ دھار لیا جس سے نہ صرف طبقۂ عوام متاثر اور خائف ہونے لگا طبقۂ اُمرا اور سلاطین بھی اس نظریئے کی شدت اور صلابت کے آگے سرنگوں ہوتا چلا گیا۔ اجتہاد کے خاتمے کے "ملت شکن" فیصلے، اسلام کی عقلی تحریکات کے استیصال اور تقلیدی مذاہب کے لازمی اجتماع نے "قتلِ مرتد" کے لئے فضا کو مزید سازگار بنا ڈالا اُسّتی دبستانِ مذاہب کے چاروں اداروں نے پہلے اگرچہ یہی طے کر لیا تھا کہ اِن دبستانوں میں سے کسی ایک سے وابستہ ہونا "مسلمانی" کے لئے کافی ہے اور ان سے خروج "نامسلمانی" کی حدود میں لے جاتا ہے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اِسے بھی غیر کافی سمجھا جانے لگا اور اب "ارتداد" کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے اس کی گرفت کو یہاں تک مضبوط کر دیا گیا کہ اِن ہی دبستانوں میں سے اگر کوئی صاحب وابستگی کو تبدیل کر کے دوسری دبستانِ فکر سے منسلک ہو جاتا تو اس پہ دین سے "مذاق" کرنے کی فردِ جرم عائد کر کے تعزیر دی جاتی۔ اِس سے نہ صرف سوچ و فکر پہ تالے پڑ گئے بڑے بڑے سلاطین تحقیق کی بجائے کسی ایک مذہب کی تقلید کو حاصلِ ایمان اور آئینِ مملکت کا لازمی جزو سمجھنے لگے کیونکہ اس میں خود ان کے اپنے استحصالی مقاصد کی تکمیل کا راز بھی پنہاں تھا اب جو شخص اس سے انحراف کرتا زمرۂ کفار و مرتدین میں شامل کر لیا جاتا اِس سے ہوا یہ کہ حاکمِ وقت

کے تیور شریعتِ مطہرہ کا عکس پیش کرنے لگے (۱) سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۱م)

(۱) علامہ یعقوب عرف ابن السکیت (۸۵۸م) لغت، ادب اور گرامر کے مستند امام تھے۔ خلیفہ متوکل عباسی (۸۶۱م) اس کے خاص معتقدوں میں سے تھے اس نے اپنے شہزادوں "المعتز" (۸۶۹م) اور "المؤید" کی تعلیم و تربیت کے لئے اسے ہی اتالیق مقرر کیا تھا۔ لیکن اس قرب و ہم نشینی کے باوصف ہوا یہ کہ ایک بار متوکل نے ابن السکیت سے دریافت کیا کہ معتز اور مؤید اچھے ہیں یا حسن اور حسین؟ اس پہ ابن السکیت نے بے ساختہ کہا کہ واللہ ان قنبر خادم علی خیر منک ومن ابنیک

بخدا تم اور تمہاری اولاد سے تو علیؑ کے خادم قنبر (   ) بھی اچھے تھے۔

(بحوالہ "الاعلام" خیر الدین زرکلی طبع دوم مصر جلد ۹/۲۵۵)

یہ سنتے ہی خلیفہ طیش میں آگئے اور ابن السکیت پہ "شیعیت" کی فرد جرم لگا کر ترکی محافظوں کو حکم دیا جنہوں نے زندہ حالت میں اس کی زبان کھینچ لی اور پیٹ چاک کر کے آنتیں باہر نکال ڈالیں۔ اس طرح اسے اٹھوا کر جب گھر بھجوایا گیا تو وہ مر چکا تھا (حوالہ مذکور)

ابنِ السکیت کی طرح ایک دوسرے کشتۂ تیغ جفا چیف جسٹس بدر الدین محمود کا دردناک انجام ملاحظہ ہو کہ یہ صاحب سلطان برقوق (۱۳۹۹م) کے بیٹے سلطان فرح کے استاذ تھے۔ معاشی مساوات کے علمبردار تھے جن دنوں آپ تبریز میں تھے فاتح ایشیا تیمور لنگ (۱۴۰۵م) نے خدمت میں حاضر ہو کر زر و جواہر کے انبار نذر کر دیئے مگر شیخ نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ــــــ اس مال کا تنہا نہ میں مالک ہوں اور نہ تم۔ اس کے مالک عوام ہیں ــــــ شیخ کے اس انقلابی نعرے سے سلطان بایزید یلدرم (۱۴۰۲م) کے بیٹے سلطان محمد I (۱۴۲۱م) نے بہت برا منایا اور دھوکہ سے "سیرز" بلوایا اور ان کے ایک حریف جسٹس حیدر الہروی کے فتوے کے مطابق (۱۴۱۸م تا ۱۴۲۰م) سولی پہ لٹکا کر علم و تقوے کے ایک ستون کو ڈھا دیا ۔ آج ریاست ہائے بلقان کے لاکھوں افراد

باقی اگلے صفحے پہ

بایں زہد و نیک نامی۔ مذہب کے بارے میں کچھ کھلا ظرف نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے خالص گردہی بنیادوں پر ازہر یونیورسٹی کو شیعہ دبستان رہنے دینے کی بجائے شافعی گہوارۂ فکر میں تبدیل کرنا مناسب سمجھا جس سے نہ صرف ان کی نیک نامی گہنا گئی۔ ان کا شعور مزید بے قابو ہونے لگا کہ شافعیت کو بزورِ شمشیر پھیلانے کے شوق میں شام،

آپ کے فلسفہ کے مطابق معاشی سوشلزم پر عامل ہیں بلکہ انہیں سوشلزم قبول کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یوگوسلاویہ، رومانیہ، البانیہ و دیگر ریاستوں میں "سماوی پارٹی" کے عنوان سے آپ کے فلسفہ کے حاملین موجود ہیں۔ بیزنطینی مؤرخ "ڈوکاس" بدرالدین محمود بن اسرائیل کے ایک عقیدت مند" بورکلوجا مصطفےٰ کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ وکان یوصی بان تکون کافة الاشیاء مثل الاکل والملبس والحیوانات والاراضی مشترکة بین عموم الناس باستثناء النساء۔

وہ اپنے ابلاغ میں زور دیتے تھے کہ ــــ عورتوں ــــ کے سوا تمام اشیاء مثلاً روٹی، کپڑے، مکان (مع زرعی اراضی) اور مویشیوں میں سب انسانوں کا حق مساوی ہے اور وہ برابر کے حصہ دار ہیں۔ (العربی نمبر ۲۶۱ ص ۱۲۸ طبع کویت)

اسی طرح ان کی حریتِ فکر کے ضمن میں ان کی یہ تحریر قابلِ غور ہے کہ۔ عیسیٰ علیہ السلام حی بروحہ و میت بجسدہ العنصری۔

عیسیٰ علیہ السلام کو روحانی زندگی حاصل ہے۔ جسم عنصری کے لحاظ سے مرچکے ہیں۔
(آپ کی تصنیف "نوادرات" بحوالہ "العربی نمبر ۲۶۱ ص ۱۲۷)

وفاتِ مسیح ہی کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ــــ "میں نے جمعہ ۸۰۸ھ ہجری میں بحالتِ مکاشفہ دو آدمیوں کو دیکھا جن میں سے ایک نے مردہ حالت میں مسیح کو اٹھا رکھا تھا اور پھر دونوں مجھے بتلا رہے تھے۔ کہ یہ مسیح ہیں جسے جسم عنصری کے ساتھ موت دی گئی ہے۔" (نوادرات)

عراق، اور حجاز کے حنفیوں کو جبر و تشدد کا نشانہ بھی بنا ڈالا اسی طرح ترکی کے سلطان سلیم اول (سن ۱۵۲۰ء) کا جب دور آیا تو اس نے اس کی مثال کو سامنے رکھ کر تیغ براں کے تعاون سے شام، عراق، فلسطین اور حجاز سے شافعیت کو چلتا کر کے حنفیت کو مملکت کا مذہب قرار دے ڈالا۔ ایران کے بنی بویہ (سنہ ۹۳۲ تا ۱۰۵۵ء) اور ترکی کے آلِ عثمان (۱۳۲۶ تا ۱۵۱۶) کی صدیوں پہ پھیلی ہوئی مذہبی جنگیں نظریۂ "ارتداد" کے تخریبی نتائج پہ زندہ گواہ ہیں۔ ان جنگوں میں ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کو محض گروہی شعور کے اختلاف کے باعث ہی فنا کے گھاٹ اتارا۔ اور یہ نہ سوچا کہ ان کی یہ حرکات آگے چل کر کن نتائج کی حامل ہوں گی اور یہ جو شریعت کے میخانے سونے پڑے ہیں تو ان کے دل نواز ساقی تنگ ظرف تھے وہ جنہیں خیراتِ محبت بانٹنا چاہیئے تھا ان کے چہروں پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹیں دم توڑ چکی تھیں اب ماتھے پر شکن تھے اور دل کی کشادگی مفقود ہو چکی تھی۔ اب تعصب اور تنگ نظری کا زہر پلایا جاتا تھا شریعت کی وہ بادۂ ارغوانی جس کے پیتے ہی روح میں بالیدگی آجاتی تھی۔ اس کی نفاست اور پاکیزگی تنگ ظرف ساقیوں کی وجہ سے عنقا ہو چلی تھی۔ آج ہم (مستشرقین کے سامنے) باہمی جنگوں اور مذہبی اساس پہ مسلم کشی کا صاف انکار کر کے جہاں حقائق چھپانے کے مجرم بنتے ہیں وہاں ان سلاطین کی ذاتی ہوس فتوحات پہ پردہ ڈالنے کی شعوری کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن حقائق اپنے وجود کا خود ہی احساس دلاتے رہتے ہیں ان پہ جتنے پردے ڈالے جائیں گے اتنے ہی زور اور تابانیوں سے ان کا ظہور ہوتا رہے گا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نظریۂ "ارتداد" اور اس کی اساس پہ "قتلِ مرتد" کے فیصلے سے اتنا نقصان غیر مسلموں کو نہیں پہنچا جتنا کہ خود مسلمان اس کی خون آشام تلوار کا لقمہ بنتے رہے۔ یہ مذہبی تشدد اور تصلب ہی تھا جس کے نتیجہ میں اسلامی سامراج کے نقیبوں اور درباری شیخ الاسلاموں نے ہلاکت اور بربادی کا طوفان

برپا کر رکھا تھا۔ احمد بن حنبل (۲۴۱ھ م) مالک (۱۷۹ھ م) اور ابو حنیفہ (۱۵۰ھ م) جس بے دردی سے گردہی" اخلاقیات" کا نشانہ بنائے گئے وہ کسے یاد نہیں اور کون نہیں جانتا کہ ان بزرگوں پر عقیدے کے " فسق " کا فتوے لگا کر دراصل " قتلِ مرتد " کی نفسیات کے مطابق ہی عمل کیا گیا تھا۔ اسی طرح " عقلی " تحریکات کو بے دردی اور سفاکی سے آغوشِ قبر میں سلا دینا بھی " قتلِ مرتد " ہی کے برگ و بار ہی تھے۔

میں تاریخ کا طالبِ علم ہوں۔ علم کو فریق بنانے کا قائل نہیں ہوں، جو قوم " علم " کو فریق بناتی ہے وہ بزدد یا بہ دیر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ میں " اخلاقیات " کی نفسیات کو بہتر سمجھنے کی استعداد رکھتا ہوں اور ایک جویائے حقیقت کی حیثیت ہی سے کہہ سکتا ہوں کہ تصویر کا اصل رخ اتنا غبار آلود اور غازہ اکاذیب اور مفتریات کی دبیز تہوں میں پوشیدہ ہو چکا ہے کہ اس کے اندر حقیقت کے نقوش اور خطوط کا پتہ چلانا بے حد دشوار ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ پوری جرأت سے اِن غباروں اور غازوں کو جھاڑ کر " حقیقت " کا اصلی رخ واضح اور نمایاں کیا جائے اور حقیقت چونکہ تلخ ہوتی ہے لہٰذا آپ کو یہ تلخی گوارا کرنا پڑے گی تو آیئے تلخ نوشی کی عادت بنائیں اور " تلخیات " سے پہلے قرآن پاک کی حیات آفریں مہک سے توانائی اور تازگی حاصل کریں کہ اس توانائی کے بعد ہی " تلخیات " نوشی کا لطف دوبالا ہوگا۔

قرآن کیا رہنمائی کرتا ہے

قرآنِ پاک سراپا علم ہے۔ سراپا روشنی ہے۔ علم اور روشنی " فریق " نہیں بنتے لہٰذا قرآنِ پاک بھی فریق نہیں بن سکتا اس کی ہدایات بلا امتیاز مذہب و ملت نوعِ بشر کے لئے عام ہیں۔ اِس وضاحت کے باوصف اس نے جتنے بھی رہنمائی کے

اصول عطا کئے ہیں مذہبی قیادت نے انہیں تسلیم نہیں کیا۔ اِن کی شرط یہ ہے کہ۔ جب تک وہ اصول۔ فقیہانہ افتاد اور محدثانہ مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوں گے اور بقیا کرسی فلسفۂ حیات سے متصادم ہوں گے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے مسلّمہ پیشوا امام ابوالحسن عبید اللہ الکرخی (۹۵۲ء م) فرماتے ہیں

"ہر وہ آیت جو اس طریقے کے مخالف ہو جس پہ ہمارے اصحاب ہیں
وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ"

(تاریخ الفقہ الاسلامی مصنفہ علامہ خضری۔ اردو ترجمہ طبع دار المصنفین اعظم گڑھ صفحہ ۳۲۱)

بات کیا ہوئی کہ دین میں قرآنِ پاک نہیں فقہائے احناف کی رائے ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن اگر ان کی رائے کے مطابق ہے تو قابلِ تسلیم ہے اگر نہیں ہے تو اس کی تاویل کر کے فقہی مزاج میں ڈھال لیا جائے گا یا اِسے منسوخ کر کے کالعدم کے خانے میں رکھ دیا جائے گا کیونکہ بقیا کرسی فلسفہ کے مطابق علماء کے اختیارات۔ اللہ کے اختیار سے کم تر نہ ہوں گے۔ اِدھر فقہاء ہی کی طرح محدثین کرام بھی قرآن و حدیث میں ٹکراؤ کی صورت میں حدیث ہی کو ترجیح دینا مناسب سمجھیں گے۔ شیخ المحدثین یحییٰ بن ابی کثیر (۷۴۷ء م) کا فرمان ہے کہ۔ السنۃ قاضیۃ علی الکتاب ولیس الکتاب بقاض علی السنۃ

"قرآن اور سنت جب ٹکرا جائیں تو فیصلہ کن حیثیت سنت ہی کو حاصل
رہے گی اِس کے برعکس قرآن کا فیصلہ مسترد کر دیا جائے گا"

(کتاب الاعتبار امام حازمی (۱۱۸۸ء م) طبع منیر دمشقی ۱۳۴۶ھ قاہرہ صفحہ ۱۰
وسنن دارمی طبع دمشق ۱۳۴۹ھ جلد ۱/۱۴۵/۲)

یحییٰ بن ابی کثیر کے الفاظ اپنے مفہوم میں واضح اور ابلاغِ معانی میں غیر مبہم ہیں کہ قرآن پاک کا وہی حکم نافذ العمل اور قابلِ تسلیم ہو گا جو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

کے سانچے میں ڈھل سکتا ہو[1] ــــ اس صورت میں جو ان سے اُصولِ رہنمائی سے بھی کام لیا جائے فقہاء اور محدثین تسلیم کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ ویسے کہنے کو یا دنیا کو یاد کرانے کے لئے۔ قرآن پاک کے ضابطہ حیات ہونے کا اس انداز سے اظہار فرمادیں گے گویا وہ غیر مشروط اصولِ ہدایت ہے۔ لیکن عملی طور پر قرآن پاک کو نہ تو اصولِ رہنمائی تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ ہی اسے غیر مشروط پوزیشن دینے کے لئے یہ لوگ تیار ہو سکتے ہیں تاہم مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن پاک غیر جانبدار ہے وہ پوری انسانیت کو مخاطب کرتا ہے۔ اور اپنے بے لاگ خطاب میں واضح فرماتا ہے کہ۔ ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتھم واولئک ھم الضالون۔

"جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی اور اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ایسے لوگوں کی پشیمانی کبھی قبول ہونے والی نہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو راہ سے بھٹک گئے۔"

(عمران ۹۰)

یہ آیت اپنے مفہوم میں واضح ہے کہ جو لوگ اسلام کو چھوڑ کر غیر مسلم بن گئے ان کی یہی سزا کافی ہے کہ وہ منزلِ مقصود سے بھٹک کر رہ گئے اور اسی طرح خود ہی خسارے اور ناکامی کے گرداب میں پھنس کر کہیں کے نہ رہے تاہم یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے لوگوں کو زندگی کی حرارتوں سے یا کسی طرح کے شہری حقوق سے محروم کیا جائے کیونکہ عمران مدنی ہونے کے باوصف "مرتدوں" کے لئے جسمانی تعزیر کا نہ اشارہ کرتی ہے اور نہ ہی "قتل" کا حکم دیتی ہے۔

ارتداد کو اگر پیشہ بنا لیا جائے؟

عمران (۹۰) کی طرح نساء بھی مدنی اور

[1] نیز۔ ملاحظہ ہو عنوان "ادراملانت قرآن مقصود مومن؟"

اس دور کی سورہ ہے جب اسلام اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نافذ، جاری اور ساری العمل تھا۔ اس میں فرمایا کہ۔ ان الذین امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا ثم ازدادو اکفر الم یکن اللہ لیغفر لھم و لا لیھدیھم سبیلا ۝

"جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایمان لائے، پھر کفر میں پڑ گئے اور پھر ایمان لائے پھر کفر کیا اور برابر کفر میں بڑھتے ہی گئے تو فی الحقیقت ان کا ایمان لانا ایمان لانا نہ تھا) اللہ انہیں بخشنے والا نہیں تھا اور ہرگز ایسا نہ ہوگا کہ (کامیابی کی) انہیں کوئی راہ دکھائی دے۔ (نساء۔ ۱۳۷)

یہ آیت نیز اپنے مفہوم میں اُس "پیشہ ور" مرتد کی حرکات و سکنات کو زیر بحث لاتی ہے جو نظریئے کی بار بار تبدیلی کے باعث دولتِ اطمینان سے محروم ہو چکا ہے۔ فرمایا "پیشہ ور" مرتد ہونا بدرجہ غایت سنگین جرم ہے کہ ایسا شخص اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو کر اپنا مقام بھی کھو بیٹھتا ہے اور دینی نقطہ نظر سے بے راہ رو بھی شمار ہونے لگتا ہے۔ تاہم اتنے سوءِ مذاق کے باوصف اس کے لئے جسمانی سزا کا نہ تو حکم ہے اور نہ اشارہ۔ (غور فرمایئے۔ صبح کو مؤمن ہیں شام کو مرتد مگر سزا کچھ بھی نہیں ہے!)

ارتداد کی کھلم کھلا تبلیغ

آیاتِ الٰہی کو پسِ منظر کے زنجیر و سلاسل سے نجات دلا کر اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں برملا۔ ارتداد۔ کے لئے بھی کوئی جسمانی سزا نہیں ہے فرمایا۔ وقالت طائفۃ من اھل الکتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا وجہ النہار واکفروا اخرہ لعلھم یرجعون ۝

"اور (دیکھو) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ ہے جو کہتا ہے (مسلمانوں کو گمراہ

کرنے کے لئے) ایسا کرو۔ کہ صبح اُن کی کتاب پر ایمان لے آؤ ـــــــ شام کو انکار کر دو۔
اس طرح عجب نہیں کہ وہ (لوگوں کو اسلام سے پھرتے ہوئے دیکھ کر خود بھی) پھر جائیں۔

(عمران، ۷۲)

ارتداد۔ کو نظریاتی فتح و نصرت کا ذریعہ بنانے کا یہ واقعہ اس دور کا ہے
جب اسلام اپنی پوری تابانی کے ساتھ چہار دانگ عالم میں طلوع ہو چکا ہے اور
مدینہ میں احکام الٰہی کا نفاذ پوری شد و مد سے جاری ہے اس کے باوصف قرآن
میں ایسی وضاحت نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے کسی یہودی مرتد کو
قتل کرنے کا الزام اپنے سر لیا ہو۔ جب کہ منافقت اور ارتداد سے تیار شدہ اس
ہیکل کی نشاندہی کے لئے وحیِ الٰہی ہمہ وقت راہبر و راہنما بھی ہے۔
مرتدوں کے ایسے ہی ایک دوسرے گروہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا۔
واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا ط واذا خلوا الٰی شیٰطینھم
قالوا انا معکم انما نحن مستھزءون ہ
"جب یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم "مسلمان" ہیں۔ لیکن
جب اپنے بڑوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے
ساتھ اور تمہاری طرح "غیر مسلم") ہیں اور ہمارا اظہارِ ایمان اس
کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہم تمسخر کرتے تھے (یہ لوگ ایمان کے معاملہ میں
تمسخر کرتے ہیں جب کہ) حقیقت یہ ہے کہ خود ان ہی کے ساتھ
تمسخر ہو رہا ہے۔ (بقرہ، ۱۵)

پھر فرمایا۔
یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت (اسلام) کے بدلے (مرتد ہو کر)
گمراہی مول لی لیکن نہ تو ان کی تجارت فائدہ مند نکلی نہ ہدایت

ہی پہ قائم رہے۔ (بقرہ، ۱۶)

بقرہ بھی مدنی ہے اور عروجِ اسلام کی نشاندہی کرتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "ارتداد" کو مشغلہ بنانے والوں میں سے کسی ایک کو بھی تہ تیغ کر کے اس جنسِ ناپاک کا خاتمہ نہیں کیا اگر کچھ کہا تو قرآن کی زبان میں ہی کہا کہ ۔ نہ تو ان کی تجارت (یعنی کاروبارِ اسلام اور ارتداد کی عادت) فائدہ مند نکلی نہ ہدایت پہ ہی قائم رہے ۔

غور ۔ فرمایئے ان کی ناشائستہ حرکات کی پاداش میں کوئی سزا اگر تجویز فرمائی تو وہ بھی جسمانی اور مادی نوعیت کی نہیں کہی جاسکتی ۔

ارتداد سے مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا:

سورۃ مائدہ میں جہاں بہت سی وضاحتیں فرمائی ہیں وہاں "مرتدین" کی بابت یہ بھی فرمایا ہے کہ

یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہٖ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ ۔ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکفرین ہ

مسلمانو تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دینِ حق کو کچھ نقصان پہنچے گا) قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ (سچے مومنوں کا) پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں ۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت ۔

(مائدہ ۔ ۵۴ ۔ ترجمان القرآن طبع زمزم کمپنی لاہور جلد ۱/۴۲۳/۱۵ تا ۱۹)

اس آیت کو پسِ مناظر کی آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک وصاف کر کے دیکھا جائے تو اس کا ایک ایک لفظ ناطق دگویا ہے کہ "مرتد" ہونے والا کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کی مسلم سوسائٹی سے علیحدگی کسی آتش فشانی کا موجب نہیں بن سکتی۔ اللہ کے ہاں ایسے پاکبازوں کی کمی نہیں جو دین کی پاسبانی کرنے کے لئے مرتد ہونے والوں کی بہ نسبت زیادہ فعال، زیادہ جاں نثار اور زیادہ موزوں ہو سکتے ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ مائدہ (ع ٥) کسی پسِ منظر کے بغیر اظہارِ مفہوم سے قاصر ہے وہ کہتے ہیں کہ۔ "من یرتد" سے مراد بنو مدلج ہیں جن کا سردار اسود عنسی (سنہ ٦٣٢ م) ہے جس نے مرتد ہوتے ہی۔ بحرین، صنعاء، حضرموت، الاحساء، عمان اور طائف پر قبضہ کیا تھا ——— (بلاذری طبع مصر ص١١١ و ص١١٣ وغیرہ)

اور یہ بھی سنایا جاتا ہے کہ اس سے مراد بنو اسد ہیں جن کا سردار طلیحۃ الاسدی (سنہ ٦٤٢ م) تھا۔ قبائل اسد، طے اور غطفان اس پر ایمان لائے تھے تاہم یہ شخص (سنہ ٦٣٢ م) میں وفاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد مرتد ہو کر دس سال تک حالتِ ارتداد ہی میں رہا پھر حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جنگِ نہاوند (عراق) میں شریک ہو کر شہید ہوا[1]

ایک تاثر یہ بھی ہے کہ "من یرتد" کا اشارہ بنو حنیفہ کی طرف ہے جن کا سردار مسیلمہ بن حبیب (سنہ ٦٣٣ م) تھا جس کی نبوت پورے صحرائے نجد میں پھیل چکی تھی۔ "جُبیلہ" اس کا صدر مقام تھا۔ اس ہی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت میں بٹوارے کی بابت خط بھی لکھا تھا[2]

اور یہ عقیدہ بھی موجود ہے کہ "من یرتد" میں ابوبکر و عمر و عثمان کے ارتداد کی طرف اشارہ ہے اور "یحبہم" سے مراد علی اور ان کی جماعت ہے۔

(١) ابن اثیر بحوالہ زرکلی طبع قاہرہ جلد ٣/٣٣٣ (٢) ابن اثیر طبع مصر جلد ٢/١٣٧ تا ١٤٠۔ بلاذری ص ٩٤ تا ص ١٠٠

جن سے اللہ کو پیار ہے ـــــــــــ (تفسیر المنار طبع مصر جلد ۶/۴۳۶)

ان کہاوتوں کے علاوہ دو چار کہاوتیں اور بھی ہیں لیکن آیہ زیر بحث میں "مَن" کا لفظ عموم کا متقاضی ہے ادھر آگے چل کر "بِقَوْمٍ" کا لفظ "نکرے" کے مقام پر آیا ہے جس کا اصول یہ ہے کہ اس کا "مشارٌ الیہ" جب متعین ہو جائے گا تو دیگر انواع و افراد اس کی ذیل سے خارج ہو جائیں گے ورنہ "مشار الیہ" کا تعدّد لازم آئے گا جو ادبیاتِ عرب کی رو سے معیوب اور نادرا ہے۔ لہٰذا آیہ زیر بحث اپنی داخلی شہادت کی رو سے تمام ایسے شبہات کا سدِ باب کرتی ہے جو اس کے "عموم" کو متاثر کرتے ہوں۔ یا۔ مرتد کے لئے کسی جسمانی تعزیر کا امکان پیدا کرتے ہوں۔ کیونکہ ایسے مواقع پر اگر "تعزیر" کا سہارا لینا ہی ضروری ہو جاتا تو قرآن کو چاہیئے تھا کہ ایسے حکم کی اپنے ہی الفاظ میں وضاحت فرماتا۔ یہ فرمایا گیا ہوا کہ۔ مرتد ہو جانا ہے تو شوق سے ہو جاؤ مگر یہ سوچ لو کہ تم نہ اسلام کا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ مومنین کا۔ تم نہیں تو اور سہی اللہ کے ہاں پاسدارانِ حق کی کمی نہیں ہے؟

ارتداد کا سفر موت کے بعد شروع ہوتا ہے

مائدہ (۵۴) کی طرح بقرہ میں فرمایا۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ ومن یرتدد منکم عن دینہٖ فیمت وھو کافر فاولٰئک حبطت اعمالھم فی الدنیا و الاٰخرۃ واولٰئک اصحٰب النار۔

اور (یاد رکھو) یہ لوگ تم سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر بن پڑے تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں ـــــ اور دیکھو تم میں سے جو شخص اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے گا اور اسی حالت

برگشتگی میں دنیا سے جائے گا تو یاد رکھو اس کا شمار اُن لوگوں میں ہوگا
جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ایسے ہی لوگ
ہیں جن کا گروہ دوزخی ہے۔

(البقرہ، ۲۱۷ ترجمان القرآن جلد ۱/ ۲۸۰/ ۹ تا ۱۲)

اس آیت پر تفصیلی بحث عنوان (قدیم ملی تقاضے) میں آرہی ہے۔ یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ۔ ولا یزالون یقاتلونکم میں اُن مرتدوں کی طرف اشارہ ہے جو پُرامن نہیں، سرکش اور باغی ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی ترکِ دین پر بزورِ شمشیر مجبور کردیں۔

دوسرا یہ کہ مرتد کو مرتد کہنے کا مرحلہ موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یعنی جب تک ایک منحرفِ دین۔ زندہ ہے تو اُسے مرتد کہنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ رجوع اور غلطی پر نظرثانی کا چانس زندگی کے آخری سانس تک تسلیم شدہ ہے۔ ہاں جب وہ "ارتداد" ہی کی حالت میں مرا تو سمجھ لو کہ وہ موت کے بعد ہی "مرتد" شمار ہوگا۔ — اس طرح یہ آیت بھی مائدہ (۵۴) کی طرح واضح کرتی ہے کہ "مرتد" کے لئے تازیست کوئی جسمانی تعزیر نہیں ہے۔

امام فخرالدین رازی (۶۰۶ھ) فرماتے ہیں۔

- آیۂ ہذا (بقرہ، ۲۱۷) نے مرتد کے بارے میں جس رخ کا تعین کیا ہے اس سے دو صورتوں کا نمایاں ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اصولی اور فروعی۔ اصولی کے مطابق متکلمین اور فلاسفۂ اسلام کا خیال ہے کہ — ایمان کی صحت کی شرط ہو یا کفر کی پختگی کی حالت — ان کا تعلق موت سے ہے کہ — ایمان اس وقت تک ایمان نہیں کہلا سکتا۔ جب تک کہ مؤمن کی موت اس پر نہ ہو… — اسی طرح کفر اس وقت

تک کفر شمار نہیں ہوگا جب تک کہ کافر کی موت بھی اس پر واقع نہ ہو۔

(تفسیر رازی طبع مصر ۱۹۳۸ء جلد ۶/ ۳۸)

رازی موصوف نے فلاسفہ اسلام کے اس اصولی ضابطے کو پھیلا کر آخر میں لکھا ہے کہ

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص پہلے مومن تھا پھر کافر ہو گیا۔ اب ہم اس کے سابقہ ایمان کو اگرچہ ایمان ہی کہیں گے لیکن خدا کے نزدیک یہ جب ہی ایمان کہلاتا ــــ کہ عرصۂ وفات تک ساتھ رہتا ــــ اسی طرح موجودہ کفر کو ہم اس صورت ہی میں کفر سے تعبیر کریں گے کہ عرصۂ وفات تک باقی رہتا۔ و ھذا ھو الذی دلت الآیۃ علیہ فانھا دلت علی ان شرط کون الردۃ موجبۃ لتلك الاحکام ان یموت المرتد علی تلك الردۃ۔

"اور یہ وہ معیار ہے جس کے بارے میں حقائق اور وحیِ الٰہی۔ بالکل ایک جیسی رہنمائی کرتی ہیں کہ ــــ اس آیت میں جن احکام کا ذکر ہوا ہے اُن کا تعلق "مرتد" کی اس حالت سے ہے جب کہ اس کی موت بھی" ارتداد "پر ہی واقع ہوئی ہو۔ یہ ایک حتمی شرط ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[1] "

اس آیت کا تیسرا قابلِ تجزیہ لفظ" حبطت اعمالھم" کا ہے جسے عنوان "اعمال ضائع ہونے سے کیا مراد ہے" میں ملاحظہ کرنا چاہیئے۔

مُرتد کو اذیت سے دوچار کر دینا حکم عدلی ہے

ذیل میں ایک ایسی آیت کا ذکر ہے جو اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے" معاھد" کی طرح "مرتد" کے احکام کو بھی واضح کرتی ہے۔ ارشاد ہے فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم

(۱) تفسیر رازی جلد ۶/ ۳۸ طبع مذکور۔

والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیہم سبیلا ہ

پس اگر وہ تم سے (اور تمہارے دین سے) کنارہ کش ہو گئے، "پُرامن" رہے اور صلح و سلامتی کا پیغام بھی بھیج بیٹھے ہیں تو پھر خدا نے تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی کہ تم انہیں چھیڑو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (النساء/۹۰)

یہ آیت اپنے مستحکم پیرایۂ بیان میں "پُرامن" مرتد کے انجام بخیر ہونے کی نوید سناتی ۔ اور واضح کرتی ہے کہ "پُرامن مرتد" کے نہ تو شہری حقوق اور سماجی رتبہ کو پامال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی جان و مال کو کسی خطرے سے دوچار کر دیا جا سکتا ہے اگر ایسا ہو گا تو "قانون مساوات" اور "ضابطۂ قصاص" کی رو سے حکومت کی ذمہ داری ہے کہ "مجرمین" کی گوشمالی کرے[1] ۔ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم (۱۹۵۸ء) آیۂ ہذا کی ذیل میں فرماتے ہیں ۔

"یاد رہے کہ قرآن نے دو حالتوں کے سوا اور کسی حال میں بھی قتلِ نفس کو جائز نہیں رکھا ہے ۔ یا تو لڑائی کی حالت ہو ۔ ۔ ۔ ۔ یا ۔ قانون کی رو سے کسی مجرم کو سزا دی جائے ۔ مثلاً قاتل کو قتل کے بدلے قتل کیا جائے ۔

(ترجمان القرآن جلد اول طبع اپریل ۱۹۴۵ء لاہور ص ۳۸۴ و ص ۳۸۵)

اور "معاھد" کی وضاحت میں لکھتے ہیں ۔

"معاھد" سے مقصود وہ تمام غیر مسلم ہیں جن سے مسلمانوں کی جنگ نہ ہو امن و صلح ہو ۔

(ترجمان القرآن جلد ۱/۳۸۴/فٹ نوٹ آیۂ نساء ۹۰)

اس طرح بغاوت اور قتلِ نفس کے قصاص کے علاوہ قرآن نے کہیں بھی قتلِ نفس کی اجازت نہیں دی اور خدا نہ تو غافل تھا اور نہ ہی کوئی چیز اس کے علم سے پوشیدہ تھی ۔ اور قرآنِ پاک جب "پُرامن مرتد" کے لئے "جان کی امان" تجویز فرماتا ہے تو

---

(۱) امام الہند مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے شمار واقعات موجود ہیں جن میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ نے ایسے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم دیا جنہوں نے کسی عیسائی یا مجوسی باشندے کو قتل کر دیا تھا"
(مکالمات ابو الکلام طبع دکن ۱۹۴۴ء ص ۲۱۵ سطر ۷ تا ۸)

اس سے اس کا مشن پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ۔

اگر کوئی فرد یا گروہ علیحدہ ہونے کے باوصف جنگ کا خواہشمند نہیں رہتا تو مقابلے اور ستانے کی "علت" بھی باقی نہیں رہتی کیونکہ۔ وحی کا اصل مقصود۔ امن و صلح ہے نہ کہ جنگ و قتل۔ لہٰذا جو لوگ کسی راوی کے سہارے قتلِ نفس کا اہتمام کرتے ہیں وہ قانون کی نظروں میں "مجرم" اور جوابی قصاص کے مستحق ہیں (۱)

عصرِ حاضر کے بالغ نظر عالمِ دین مفتی محمد عبدہٗ (۱۹۰۵ء) فرماتے ہیں۔

"جو لوگ سورۂ نساء کی آیت (۹۰) فان اعتزلوکم کو "مرتدوں" سے متعلق قرار دیتے ہیں ان ہی کے احکام سے بحث کرتی ہے کہ یہ جب پُرامن رہیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے (اذا کانوا سالمین لا یقاتلون)۔ کیونکہ قرآن پاک میں کہیں بھی ایسا حکم نہیں ہے جس سے مرتد کا قتل کیا جانا ثابت ہوتا ہو (ولا یوجد فی القرآن نص بقتل المرتد) ——— اور جب اس حکم کے خلاف کوئی دوسرا حکم آیاتِ الٰہی میں نہیں ہے جسے ہم حیثیت ہونے کی وجہ سے ناسخ کہا جاسکتا ہو۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ "مرتد" کے لئے پیامِ اجل مقرر کیا جائے؟ ہاں ایک صحیح حدیث (من بدل دینہ) سے قتلِ مرتد کا ثبوت ضرور ملتا ہے اور جمہور کا فیصلہ بھی یہی ہے لیکن حدیث کے ثبوت اور جمہور کے فیصلے سے قرآن کے واضح فیصلے کو نہیں بدلا جاسکتا۔ اتنا تو یہ لوگ خود بھی مانتے ہیں کہ حدیث کے ذریعہ قرآن پاک کو منسوخ اور مسترد کردینے میں اختلاف ہے (وفی نسخ القرآن بالسنۃ الخلاف المشہور) (۲) "(تفسیر "المنار" طبع مصر جلد ۵/۳۲۰)

---

(۱) امام الہند ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ——— "اگر آج ہندوستان میں اسلامی حکومت موجود ہوتی اور بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے وہی قوانین نافذ ہوتے جو ساتویں اور آٹھویں صدی مسیحی میں دمشق اور بغداد کی عدالتوں میں نافذ تھے اور ایسا ہوتا کہ ایک مسلمان ایک ذمی (غیر مسلم شہری کو) قتل کر ڈالتا تو یقیناً وہ اسی طرح قتل عمد کا مجرم قرار دیا جاتا جس طرح دنیا کی تمام عدالتوں کے نزدیک قرار دیا جا سکتا ہے۔ (مکالمات ابوالکلام طبع دکن ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۱۳/۱۴ تا ۱۹) ——— (۲) مفتی علیہ الرحمۃ کا ذہن اس طرف منتقل نہ ہوسکا کہ حدیث "من بدل دینہ" قواعدِ صحیح کی رو سے نہ صرف وضعی ہے بلکہ سچائی کی توانائیوں سے خالی بھی ہے تفصیل آرہی ہے۔

اللہ اللہ۔ قرآنِ حکیم نے خلقِ خدا کی اس صنف کو اپنی آغوشِ شفقت میں پناہ دے رکھی ہے جو بدقسمتی سے "پرامن مرتد" "کافر"۔ معاہد اور ذمی جیسے ہتک آمیز ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہے لیکن اتنی واضح پالیسی کے باوجود ہماری دینی قیادت اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اور یہ تک سوچنے پر آمادہ نہیں کہ پاکستانی پرچم میں خواہ دکھاوے کی حد تک ہی سہی اقلیتوں کا نشان سفید پٹی موجود ہے۔

اور کہ پاکستان نے ہیگ کی انسانی حقوق کی سفارشات پر دستخط کر رکھے ہیں ——

اور کہنے کو ۱۹۸۰ء کے پاکستان کو مکمل طور پر اسلامایا گیا ہے پھر بھی اقلیتوں کے بارے میں کوئی متوازن پالیسی ندارد ہے۔ ہندوستان یا دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک میں مسلمانوں کی "مقدسات" کی بے حرمتی کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ ان کے بدلے میں یہاں کے ذمیوں، معاہدوں اور پُرامن مرتدوں کی "مقدسات" کو جلا دیں، گرا دیں اور تہس نہس کر ڈالیں؟ آخر ۱۹۸۶ء کے اوائل میں جیکب آباد اور سکھر کے مندروں اور رحیم یار خان کے گرجا گھروں اور احمدیوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کس قاعدے، قانون اور اخلاقی جواز کے ماتحت روا رکھی گئی؟ اور جو ملک اپنی اقلیتوں کی حفاظت نہیں کر سکتا اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کے لئے امتیازی حیثیت کا اعلان کرے؟ مہذب معاشرے کے باشعور لوگ منفی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا کرتے۔

آیۂ زیر بحث (نسار ۹۰) کا آخری لفظ "سبیلا" کا ہے جو نکرہ بن کر آیا ہے۔ یعنی مرتدوں اور معاہدوں سے کسی بھی طرح کی دل آزاری۔ اعصابی اذیت۔ یا سرد و گرم چھیڑ چھاڑ کے سے حالات پیدا کرنا قطعاً ممنوع اور قرآنی وضاحت کے مطابق صریح حکم عدولی کے مترادف ہے۔ یہ اللہ کا فرمان ہے اور اللہ نہ غافل ہے نہ نسیان زدہ!!

جبر سے نفاق پھیلتا ہے

دنیا میں جتنے بھی اخلاقی جرائم ہیں اپنی حد تک سبھی قابلِ مذمت اور بُرے ہیں لیکن دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ضمیر کے جرم اور منافقت کو جتنا بدترین اور خطرناک سمجھا گیا ہے وہ زیادہ قابلِ مذمت ہے (۱)۔ ذیل کی آیات میں زور دے کر واضح کیا ہے کہ کفر اور اسلام ــــ یا یہ کہ انسان جس طرح بھی اطمینان حاصل کر کے کسی نظریئے کو قبول کر لے اس پہ پابندی نہیں ہے ــــ ہاں اس پہ صرف اتنی پابندی ہے کہ اظہارِ بیان کے لئے ایسا لہجہ اختیار نہ کر پائے جس سے دوسرے کے جذبات کو ٹھیس پہنچے اور وہ کسی اچھے ردِّ عمل کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ یہ حسنِ اخلاق اور عمدہ برتاؤ کسی منافقت کے نتیجہ میں نہ ہونا چاہیئے۔ فرمایا۔

> دین کے بارے میں جبر نہیں کہ ہدایت و گمراہی واضح ہو چکے ہیں تاہم باطل سے انکار اور خدائے واحد پہ ایمان لانا اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ اس نے اللہ کی رسی کو تھام لیا ہے جو ٹوٹنے والی نہیں ہے۔
> (بقرہ ۲۵۶)

نیز فرمایا۔

> ہم نے انسانوں کے لئے یہ کتاب تم پہ نازل کی ہے۔ پس جس نے اس سے رہنمائی حاصل کی اس کا اپنا فائدہ ہے۔ جو بدراہ ہوا اس کا وبال اس کی ذات پہ ہے۔ تم سے اُن کے عمل پہ نہ باز پرس ہوگی اور نہ ہی تم ان کے مختار (کل) ہو۔ (زمر ۴۱)

اور مزید ارشاد ہوا۔

> تم اپنا عمل سرانجام دیئے جاؤ اور میں بھی اپنا عمل کرتا رہوں گا۔ یہ

---

(۱) اگرچہ نفاق کا تعلق عہدِ پیغمبری سے ہے اور اس کی اطلاع صرف اللہ میاں دے سکتے ہیں تاہم اصطلاحی نفاق سے ہٹ کر دیگر اصناف کے نفاق سے مفر بھی نہیں ہے۔

فیصلہ خدا ہی کرے گا کس کا عمل بخیر اور مقام کیا ہے؟ ہاں۔ یہ حقیقت ہے کہ۔ ظالم فطرت کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ (انعام، ۱۳۵)

یہاں (۱۳۵) میں واضح اعلان ہے کہ انسانوں کا "عقائدی" فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ ظالموں کو حق پرستوں کے مقابلے میں کامیابی نہیں دیتا لہٰذا وہ متحارب گروہوں میں سے کسی ایک کو کامیاب کر کے بتلا دے گا کہ سچائی کس کے ساتھ تھی اور کون سچائی کو جھٹلانے والا تھا؟۔ اس طرح حقیقت آشکارا کرنے کا معاملہ ذاتِ کبریا نے اپنی ذات پر اٹھا رکھا ہے کیوں کہ حضرتِ انسان سچائی کی پہچان کے لئے رنگ دار چشمہ استعمال کرنے کے باعث حقیقت شناس نہ بن سکتا تھا وہ اتنا بھی روادار نہیں بن سکا کہ۔ کلمہ گوئی میں شریک و سہیم کسی دوسرے فریق کو مسلمان تسلیم کرنے پر آمادہ ہو۔

عقیدہ بدلنے کیلئے "جبر" کا استعمال

فرمایا۔ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی "دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں (کیونکہ وہ دل کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے اور جبر و تشدد سے اعتقاد نہیں پیدا کیا جا سکتا) بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جسے چاہیں اختیار کریں)[1] "

یہ آیت اپنے مفہوم میں واضح ہے کہ جس طرح کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح مرتد کو بھی اسلام کے حوالے سے جبر و اکراہ کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسے نہ حبسِ بے جا میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی "قتل گہ" شریعت کی طرف ہانکنے کی اجازت ہے۔ امام الہند ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ (۱۹۵۸ء م)

(۱) بقرہ، ۲۵۶ ترجمان القرآن ۱/ ۲۹۵

اس کی ذیل میں فرماتے ہیں۔

اس اصلِ عظیم کا اعلان کہ دین و اعتقاد کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر و استکراہ جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد و یقین کی راہ ہے اور اعتقاد، دعوت و موعظت سے پیدا ہو سکتا ہے نہ کہ جبر و استکراہ سے۔

(ترجمان القرآن جلد ا/ ۲۹۵ فٹ نوٹ)

یعنی کہ آیۂ زیرِ بحث اس اصلِ عظیم کا اعلان ہے کہ۔ اسلام عقیدے کی آزادی عطا کرتا اور اپنا وجود تسلیم کرانے کے لئے وسائل اکراہ کو استعمال میں نہیں لاتا اس کے محاسن میں سے ہے کہ وہ حکمتِ عملی اور حسنِ اخلاق و حسنِ بیان سے خطاب کر کے اپنا کام ختم کر دیتا ہے۔ اب جو لوگ اسلام کے لئے ابتداء میں جبر کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ لازمی طور پر دائماً بھی عمل پیرا ہو سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو اسلام جبر کے ذریعہ رواج پائے گا وہ فاسد محض ہو گا۔

مودودی اخلاقیات کیا رہنمائی کرتی ہیں؟

مودودی صاحب مزاج اور مسلک کے لحاظ سے

نافع بن ازرق (۶۸۵ء م) اور عکرمہ بن خالد (۷۲۳ء م) کے پیروکار ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر بے حد و حساب خون بہانے کے شدت سے قائل ہیں۔ ان کے خیالات ڈھکے چھپے نہیں ہیں "عملی" طور پر ان کی "البدر" اور "الشمس" فوج کے کارنامے اور پاکستان میں کروڑوں مسلمانوں کو نشانۂ تکفیر بنانے کا سیاہ کردار زندہ ثبوت اور گواہ ہیں۔ آپ آیۂ زیرِ بحث کے بارے میں ایسی منفی رائے رکھتے ہیں جسے آیۂ کریمہ کا مزاج ہضم ہی نہیں کر سکتا۔ وہ اصلی کافروں کو مستثنیٰ کر کے مرتدوں کو ہر حال میں تہِ تیغ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

جہاں تک دین میں جبر نہیں کی آیت کا مطلب ہے تو اس کا صرف یہ

مطلب ہے کہ کسی غیر مسلم کو زبردستی اسلام میں نہیں لایا جاسکتا۔ البتہ مسلمان ہونے کے بعد اگر وہ دین سے پھرے تو اسے واپس لایا جاسکتا ہے ــــــــــ (نوائے وقت ۳ جون ۱۹۶۳ء ص۶)

اور اس کی وضاحت میں فرمایا جاتا ہے کہ

فوج کی مثال دی جاسکتی ہے کہ کسی کو فوج میں آنے پر مجبور نہیں کیا جاتا لیکن اگر کوئی شخص فوج میں آجائے تو پھر اسے واپس نہیں جانے دیا جاتا۔

(حوالہ مذکور)

مودودی نے یہاں کسی قاعدے، قانون کا سہارا نہیں لیا وہ سخن شناس ہوتے تو حرف "لا" میں جو نفی کامل موجود ہے اس کا احساس کرتے لیکن عربیت کے اصولوں سے چونکہ وہ آشنا نہیں تھے لہٰذا اپنی ذہنی اختراعات ہی کو دلیل و حجت گردانتے رہے۔ یہاں "اکراہ" کا لفظ "نکرے" کے مقام پر آیا ہے جو عمومیت کا خواہاں ہے یعنی اکراہ کی شکل کوئی سی ہو اور اس کا نشانہ بننے والا کوئی بھی فرد ہو ــــــــــ!

اور اسی "نشانے" کی نفی کامل کے لئے حرف "لا" کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی "لا اکراہ" کا پورا فقرہ "نکرے" کی حیثیت واضح کرتا ہے جو گرامر کے اصول کے مطابق۔ نکرہ جب نفی کے سلسلہ میں در آئے تو وہ خود کار حیثیت سے عموم کا صیغہ بن جاتا ہے اور معنے ہوں گے ــــ ہمہ قسم کا اکراہ ممنوع ہے ــــ یعنی یہ اکراہ آپ کی کافر کو مسلمان بنانے کے لئے ہو یا "مرتد" کو نوکِ شمشیر سے اسلام میں واپس لانے کے لئے ــــ ممنوع اور مذموم ہے ــــ امام شوکانی (۱۸۳۴ء م) اپنی "اصولی" "کتاب" "ارشاد الفحول" میں فرماتے ہیں۔ والنکرۃ فی النفی فانہا تعم (ص۱۱۹/۶) لو لم تکن النکرۃ فی النفی للعموم لما کان

قولنا لا الٰہ الا اللہ نفیا لجمیع الآلھۃ سوی اللہ سبحانہ

نکرہ جب نفی کے مقام پہ آئے تو عموم کا متقاضی ہوجاتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو "لا الٰہ الا اللہ" کہنے سے اللہ کے ماسوا دیگر آلہیہ کی نفی "ناممکن" ہوجاتی۔

(ارشاد الفحول طبع مصر ص۱۱۹ / ۱۰ تا ۱۱)

مودودی صاحب کے اقتباسات اپنے مفہوم میں واضح ہیں ان کی نوک پلک درست کرنے کی جسارت نہیں کی گئی۔ ان میں مودودی صاحب نے آیۂ "لا اکراہ فی الدین" میں شرانگیز مغالطہ آفرینی سے کام لیا ہے وہ پوری دھٹائی سے لکھتے ہیں کہ ـــــ "مسلمان ہونے کے بعد اگر وہ دین سے پھرے تو اسے واپس لایا جا سکتا ہے"

یہ "واپس لایا جانا" قرآن پاک میں صریح اضافہ ہے کیونکہ "لا اکراہ" کے عمومی لہجہ سے مودودی صاحب کی معنی آفرینی کی صریح نفی ہوجاتی ہے۔ اکراہ اسلام قبول کرنے کے لئے ہو خواہ اسلام میں واپس لانے اور اس پہ قائم رکھنے کے لئے وحیِ الٰہی نے بغیر تخصیص و استثناء اور امتیاز کے اسے مذموم اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

آیۂ زیرِ بحث جس کے ساتھ مودودی نے ناشائستہ مذاق روا رکھا ہے اس کی بابت امام محمد عبدہ (۱۹۰۵ء م) نے اپنے خاص زاویہ سے وضاحت فرمائی ہے کہ ـــــ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ نہیں ہوئی اور یہی اس کی بنیادی خوبی ہے۔ کہ اس سے پہلے اتنی انسانیت نواز پالیسی کا کسی بھی شریعت میں سراغ نہیں ملتا۔ بلکہ جدید اور قدیم دنیا کے تمام قوانین اور شریعتوں سے اسلام ہی نے سبقت لے کر عقیدے کی آزادی کا ایسے جامع الفاظ میں اعلان فرمایا جسے آج کی مہذب دنیا

اتفاق رائے سے قبول کر چکی ہے۔ فرماتے ہیں۔

ویستحیل ان یکون الاذعان بالالزام والاکراہ وانما یکون بالبیان والبرھان۔

دل کا اعتقاد۔ جبر اور اکراہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ حکمت۔ موعظت۔ حسنِ بیان اور دلیلِ قاطع سے ہوتا ہے۔

(خلاصہ از تفسیر "المنار" طبع مصر جلد ۳/ ۳۶ تا ۴۰)

امام عبدہ نے جس فکر کا سہارا لیا ہے اس کی اصل و اساس ذیل کی آیت پر ہے۔ فرمایا۔

ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم جميعا افانت تكره الناس حتى يكونوا مؤمنين ○

اور (اے پیغمبر) اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جتنے آدمی روئے زمین پر ہیں سب کے سب ایمان لے آتے (اور دنیا میں اعتقاد و عمل کا اختلاف باقی ہی نہ رہتا لیکن تو دیکھ رہا ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی مشیت یہی ہوئی کہ طرح طرح کی طبیعتیں اور طرح طرح کی استعدادیں ظہور میں آئیں، پھر اگر لوگ نہیں مانتے تو) کیا تو ان پر جبر کرے گا کہ جب تک ایمان نہ لاؤ۔ میں چھوڑنے والا نہیں۔

(یونس، ۹۹ ترجمان القرآن طبع بجنور انڈیا جلد ۲/ ۱۷۰

اس طرح یہ آیت بھی اپنی ہمزاد آیت (البقرہ، ۲۵۶) کی طرح واضح اور روشن ہے کہ۔ دین کے بارے میں کسی بھی فرد بشر کو نشانۂ اکراہ و اجبار نہیں بنایا جا سکتا۔

امام الہند فرماتے ہیں۔

یہاں آیت (۹۹) میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور غور کرو کتنے مختصر لفظوں میں کتنی عظیم الشان بات کہہ دی ہے؟ فرمایا فکر و استعداد

کا اختلاف یہاں ناگزیر ہے اور ایمان کوئی ایسی چیز نہیں کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے؟ یہ تو اسی کے اندر پیدا ہوگا جس میں فہم و قبول کی استعداد ہے پھر اگر تم پر یہ بات شاق گذرتی ہے کہ کیوں لوگ مان نہیں لیتے۔ تو کیا تم لوگوں پر جبر کرو گے کہ نہیں تمہیں ضرور مان ہی لینا چاہیئے۔

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ قرآن کے نزدیک دین و ایمان کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں جبر و اکراہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جبر و اکراہ کی صورت کا ذکر ایک ــــ "اَنُ ھو نی" اور "ناکر دنی" بات کی طرح کیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت (۲۵۶) اس بارے میں قرآن کا مقررہ "قانون" ہے کہ ــــ لا اکراہ فی الدین (ترجمان القرآن ۲/۱۷۱ تا ۱۷۲)

مودودی اخلاقیات کا دوسرا نکتہ

مولانا مودودی فرماتے ہیں ــــ "البتہ مسلمان ہونے کے بعد اگر وہ دین سے پھرے تو اُسے واپس لایا جا سکتا ہے"

مولانا مودودی کی طرح وحیِ الٰہی اگر کسی طرح کے اجبار و اکراہ کو گوارا کرتی تو سبقت کر کے خود ہی اس کا اظہار فرما دیتی لیکن یہاں الٹا یہ فرمایا گیا ہے کہ ــــ اللہ اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو ایمان پر متحد کر سکتا تھا لیکن اس کا قانون (حریتِ فکر) اس کی اجازت نہیں دیتا تھا لہذا اس نے ایسا نہیں کیا۔ سورۂ یونس میں صاف فرمایا۔

فمن اهتدى فانما يهتدى لنفسه ومن ضل فانما يضل عليها وما انا عليكم بوكيل ٥

(اے پیغمبر) ان لوگوں کو کہہ دو کہ۔ اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف

سے سچائی تمہارے پاس آگئی ہے پس جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا اور جو بھٹکے گا تو اس کی گمراہی اسی کے آگے آئے گی۔ میں تم پہ نگہبان نہیں ہوں کہ زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے جاؤں اور پھر اس سے نکلنے نہ دوں ــــ (یونس، ۱۰۸)

آیۂ زیر بحث (یونس، ۱۰۸) واضح کرتی ہے کہ سچائی اور ہدایت اسلام ہی کے دو وصف ہیں اور اسلام فریق نہیں غیر جانبدار ہے اس سے بھٹک جانے کے بعد پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ بھٹکنے نہ دے اور زبردستی کسی راہ میں کھینچ لے آئے۔ اور پھر اس سے نکلنے ہی نہ دے۔

آیۂ ہذا میں "مَنْ" کا لفظ قابلِ غور ہے جو کسی خاص مدرسۂ فکر سے تعرض نہیں کرتا یعنی کوئی بھی انسان وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم اگر سچائی اور ہدایت کی راہ اختیار نہیں کرتا تو اس کا ذاتی نقصان ہے پیغمبر کا یہ کام نہیں ہے کہ اسے زبردستی راہِ صداقت پہ لے آئے۔ سلف میں امام ابن جریر طبری (۹۲۳ء م) بھی اسی خیال کے مؤید تھے اور فرماتے تھے کہ۔ اسلام سے نکلنے والے کو اسلام پہ جبراً روک رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے" وما انا علیکم بوکیل" کی ذیل میں رقم طراز ہیں۔ وما انا علیکم بمسلط علی تقویمکم۔

میں تمہیں اسلام پہ قائم رکھنے کے لئے مسلط نہیں کیا گیا کہ اس پہ تمہیں روک رکھوں۔

(طبری طبع حلبی مصر ۱۹۵۴ء م جلد ۱۱/۱۷۸/۱۱)

تفسیر المنار" وہ بلند پایہ تفسیر ہے جسے عصرِ حاضر کے سلفی مدرسۂ فکر کے پیرو کار بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس میں علامہ رشید رضا مرحوم (۱۹۳۵ء م)

فرماتے ہیں۔ وما انا علیکم بوکیل ای وما انا بموکل من عند اللہ بامور کم و مسیطر علیکم فاکرھکم علی الایمان وامنعکم بقوتی من الکفر و العصیان ٥

میں اگر تمہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے نہیں آیا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تمہیں ہدایت کے بعد کفر کی راہ اختیار کرنے سے بزورِ شمشیر (امنعکم بقوتی) باز رکھوں۔

(المنار دوم مصر ۱۹۵۳ء جلد ۱۱/۴۹۳/۱۰ تا ۱۲)

یہاں یونس (۱۰۸) کی پالیسی واضح ہے کہ۔ وحیِ الٰہی نہ تو اسلام میں شامل کرنے پر مجبور کرتی ہے اور نہ ہی شمول کے بعد کفر کی راہ اختیار کرنے سے تلوار کے زور سے روکتی ہے اس میں کہیں نہیں لکھا کہ ——— "مسلمان ہونے کے بعد اگر وہ دین سے پھرے تو اسے واپس لایا جاسکتا ہے"؟

حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب نے ایک ایسی آیت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے جس کے بارے میں امتِ اسلام کی سوچ بالکل مختلف ہے وہ دیکھتے ہیں کہ "لا اکراہ" کا عمومی لہجہ جس طرح اسلام قبول کرانے کے جبر کو مانع ہے اسی طرح اسلام میں واپس لانے کے اکراہ کا بھی مخالف ہے۔ بنابریں وہ مودودی کی تعبیر و تشریح کو پرِ کاہ جتنی وقعت بھی نہیں دے سکتے۔ پھر یہ کہ جہالت کے دور میں ایسی باتیں شاید معیوب نہ ہوں کہ اس وقت قومیں صحیح بصارت سے محروم ہو جاتی ہیں لیکن علم و دانش کی روشنی جب فراوانی سے موجود ہو اس وقت قوموں کی بینائی کو چیلنج کرنا عجب سا لگتا ہے مودودی نے لوگوں کو اندھا بنانے کا دھندا ایسے وقت میں شروع کر رکھا ہے جب کہ ہر شخص دلیل و منطق کی عینک لگانے کا عادی بن چکا ہے۔

مودودی اخلاقیات کا تیسرا نکتہ اسلام کا فوجی مزاج

مودودی صاحب نے اپنی توانائیاں اس بات پر صرف کر دی ہیں کہ جیسے بھی بن پڑے آیۂ "لا اکراہ" کو بے نور بنا کر لوگوں پر واضح کیا جائے کہ ——— اسلام کے فوجی مزاج کو نہیں بدلا جا سکتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

کسی کو فوج میں آنے پر مجبور نہیں کیا جاتا لیکن اگر کوئی شخص فوج میں آجائے تو پھر اسے واپس نہیں جانے دیا جاتا۔

(نوائے وقت ۳ جون ۱۹۶۳ء)

اسلامی عقائد اور مولانا مودودی کا یہ استدلال بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

نیز اسلام قبول کرنے کو فوج میں بھرتی ہونے اور اس سے انحراف کو فوج سے انحراف کرنے پر قیاس کرنا۔ قیاس مع الفارق ہے۔ اسلام اور فوجی قوانین میں جو فوارق (DIFFERENCES) موجود ہیں اُنہیں ایک خونخوار ملاں کی فکر پریشان سے ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فوج کے دخول و خروج کے قوانین ایک تو بین الاقوامی طور پر یکسانیت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں یعنی سبھی نے انہیں تسلیم کیا ہوا ہے لیکن مذہب میں دخول و خروج کے ضابطے بین الاقوامی شعور سے ہٹ کر ترتیب دیئے گئے ہیں خاص کر یہ ضابطے ان ہی لوگوں کی ذہنی غمازی کرتے ہیں جنہیں ہمہ روشنی سے محروم ——— مذہبی ریاستوں نے اپنا کر انسانی تشخص کی ہتک کی ہے لہذا یہ ضابطے انسانی نقطۂ نظر سے جس طرح یکسانیت اور ہم آہنگی کی ذوق تک سے عاری ہوتے ہیں اسی طرح اس قابل بھی ہیں کہ انہیں بہ سر دیوار مار دیا جائے۔

کیا مودودی صاحب اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ۔ فوجی خدمات کے لئے بسا اوقات جبراً بھی بھرتی کیا جاتا ہے۔ تو کیا اسلام میں داخل کرنے کے لئے

بھی ایسا قانون موجود ہے؟۔ اسی طرح فوجی خدمات کیلئے شمولیت دائمی نہیں خاص وقت تک کے لئے ہوتی ہے اس کے بعد انہیں ریٹائر کر کے گھر بھیج دیا جاتا ہے تو کیا اسلام میں شمولیت بھی عارضی اور کسی خاص وقت تک کے لئے ہوتی ہے؟ نیز افواج میں شمول کے لئے عاقل، بالغ اور تنومند و توانا ہونا ضروری ہے تو کیا اسلام کے لئے بھی ان ہی شرائط کو عائد کیا جا سکتا ہے؟۔ کیا بد صحت، بے وقوف اور کمسن کا اسلام فوجی قواعد کے اتباع میں قابل تعرض نہیں ہوگا؟ نیز آرمی ایکٹ کے مطابق ایک فوجی اعضائے رئیسہ، ہاتھ پاؤں اور اعضائے حاسہ۔ آنکھ، کان سے جونہی محروم ہو جاتا ہے تو اسے مدت پوری کرنے سے پہلے ہی خدمات سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اب فوج کے قابل نہیں رہا تو کیا ایک آدمی اسلام میں رہ کر اگر کچھ بے چینی محسوس کرتا یا کسی اجارہ دار جنت کی اسلام سوز حرکات سے اطمینان کے بجائے وبال جان بیٹھتا ہے تو ان ناقابلِ اندمال زخموں کے باعث اُسے خارج کر دیا جائے گا؟ میرا خیال ہے اس پر آمادہ ہونا مشکل ہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اتنے فوارق کی موجودگی میں اسلام کو فوج پر قیاس کر کے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے اور تکذیبِ وحی (یونس ۱۰۸) (بقرہ ۲۵۶) مستزاد۔

"لا اکراہ" پر نسخ کا وار

ایک ایسی آیت جو دین اور عقیدے کے بارے میں قرآن کی انٹرنیشنل پالیسی واضح کرتی اور مدینہ منورہ میں اس دور کی آئینہ دار ہے جب مسلمان پوری طرح محفوظ اور اپنے معاملات میں کسی دباؤ کا شکار نہیں تھے لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہمارے فقہا اُسے ہی منسوخ ٹھہراتے اور اپنی کج اذہانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کالعدم کے خانے میں رکھ دیتے ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی (۵۴۸ھ) اور ابوبکر عرف "الجصاص" نے اپنی ہمنام تفسیر "احکام القرآن" میں اسے

منسوخ کیا ہے جب کہ نسخ کے بارے میں کوئی متفقہ توجیہ پیش کرنے سے یہ لوگ عاجز بھی تھے۔ اب جہاں تک نسخ کا تعلق ہے تو اس کا تفصیلی جواب راقم کی تفسیر "منسوخ القرآن" طبع لاہور منسوخ ۲۹ صـ ۲۶۱ تا صـ ۲۶۴ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے یہاں اعادے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت!!

اعمال ضائع ہونے سے کیا مُراد ہے؟

کچھ لوگوں نے بقرہ (۲۱۷) کی اساس پہ قتل مرتد کے گھناؤنے جرم میں وحیِ الٰہی کو شامل کرنے کی جسارت بھی کی ہے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس وحشیانہ سزا کا انحصار روایات اور علماء کے اجماع پہ ہے، قرآن پاک سے اس کی سند فراہم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ایک صاحب نوائے وقت میں یہ "تاثر" بھی دیتے ہیں کہ ابن حیان اندلسی آیہ "من یرتدد منکم عن دینہ (بقرہ، ۲۱۷) کے تحت فرماتے ہیں کہ۔ حبوط العمل فی الدنیا

هو بطلانه فی الدنيا باستحقاق قتله

(جلد دوم تحت آیۂ مذکور (نوائے وقت ۳ جون ۱۹۹۳ء)

یعنی مرتد کے عمل ضائع ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اسی دنیا میں گردن زدگی کے مستحق ٹھہرا دیا گیا"

مضمون نگار جس کے مبلغ علم کا پتہ نہیں چل سکا ضمناً یہ وضاحت بھی کر جاتے ہیں کہ مذکورہ عبارت ابن حیان کے حاشیہ نویس کی ہے ـــــ عبارت کسی کی بھی ہو ہمارے نزدیک ابن حیان (۱۳۴۴ء م) ہوں خواہ اس کے حاشیہ نویس۔ مفہوم سب کا یہی ہے کہ۔ ان کے نزدیک اعمال ضائع ہونے سے گردن زدنی لازم آجاتی ہے جب کہ یہ آیت قتلِ مرتد پہ روشنی ڈالنے کی بجائے مرتد کے "مقام" کا تعین کرتی ہے کہ حالتِ ارتداد پہ جب اس کی موت واقع ہو تب کی

اس کا شمار کافروں میں سے ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کو عین حیات کافر سے موسوم نہیں کیا جا سکتا تو اس کے لئے سزائے موت کیوں کر تجویز کی جا سکتی ہے؟ ہمارے خیال میں "حبوطِ اعمال" کا اگر وہی مفہوم ہوتا جو ابن حیان وغیرہ نے سمجھ رکھا ہے تو ضروری تھا کہ مرتدین کو تہ تیغ کرنے والے دیگر علماء بھی لپک کر اسی ہی آیت کو لے لیتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان کی مطلب براری کا کام نہ دے سکتی تھی۔ ابن حیان نے اگر اپنے فہم کے مطابق ایک اختلافی پہلو تراش ہی لیا ہے تو اس کے وہ خود ہی ذمہ دار ہیں اور ہم کسی ایسی تفسیر کے پابند نہیں ہو سکتے جو وحیِ الٰہی کا منشا رگردی بنیادوں پر تعین کر کے ہم سے تصدیق و تائید کا مطالبہ کرتی ہو۔ اگر اعمال ضائع ہونے کا یہ سلسلہ چل نکلا تو ہم بیسیوں اُن اشخاص کی نشاندہی کر سکتے ہیں جو مشتبہ چہرے اور ملکوتی شکلیں بنانے کے باوصف نامۂ اعمال سیاہ رکھتے ہیں لیکن نہ تو انہیں قتل کیا جاتا ہے اور نہ ہی اسلام سے نکل جانے کا نوٹس دیا جاتا ہے۔

اعمال کے اکارت جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت میں امام رازی یہ تاثر دیتے ہیں کہ آیۂ بقرہ (۲۱۷) نے مـرتـد کے بارے میں جس رخ کا تعین کیا ہے اس سے دو صورتوں کا نمایاں ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

اصولی اور فروعی۔ اول الذکر کی تفصیل معلوم ہو چکی[1] اور فروعی کے مطابق امام شافعی (۲۰۴ھ م) کا مسلک ہے کہ ایک شخص ایمان کی حالت میں صلوٰۃ قائم کرنے کے بعد مرتد ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس پر صلوٰۃ کا اعادہ واجب نہیں ہے کہ اس کا عمل ضائع

(۱) ملاحظہ ہو عنوان "ارتداد کا سفر موت کے بعد شروع ہوتا ہے"

نہیں گیا ــــــــ (تفسیر امام فخر الدین رازی طبع مصر جلد ۶/ ۳۸، ۳۹)

اسی طرح حج کا معاملہ بھی ہے کہ مرتد ہونے کی حالت میں وہ ضائع نہیں جاتا کہ موت کے بعد ہی اس پر کفر کا اطلاق ہونا چاہیے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آیۂ زیرِ بحث اعمال کے اکارت جانے کی شرط یہ ٹھہراتی ہے کہ مرتد کی موت بھی ارتداد پر واقع ہو۔ لیکن ہم جس شخص کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اس پر مذکورہ شرط عائد ہی نہیں ہو سکتی ہے یعنی عمل ضائع کرنے کی بڑی علت "موت" ہے کہ اس کے بعد ہی ارتداد کا سفر شروع اور محنت کا ثمر اکارت ہو جاتا ہے (۱)۔

رازی کی طرح امام العصر مفتی محمد عبدہ علیہ الرحمۃ نے بھی مسلکِ شافعی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

فقہ میں ایسے بھی احکام ملتے ہیں جو صرف "مرتد" سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً ایک حاجی عرصہ دراز (مدة طويلة) تک حالتِ ارتداد میں گزار کر بعد میں اسلام کی طرف لوٹ آتا ہے تو کیا ــــ اس کے وقفۂ ارتداد کے اعمال ضائع تصور کر کے اس پر حج کا اعادہ اور بیوی سے تجدیدِ نکاح لازم ٹھہرائے جائیں گے؟ ــــ بہت سے علمائے امت کا کہنا ہے کہ "حبطت اعمالہ" کا تعلق موت سے ہے جو ابھی واقع نہیں ہوئی لہذا اُسے نئے حج اور نئے نکاح کی ضرورت نہیں ہے (۲)

(بحوالہ "المنار" طبع مصر جلد ۲/ ۳۱۸)

---

(۱) تفسیر رازی جلد ۶/ ۳۹ (۲) اصل عبارت یوں ہے۔ فاذا ارتد المسلم مدة طويلة لايجب عليه نحو الحج الخ

یہ تو تھی متکلمین اسلام، امام شافعی اور مفتی محمد عبدہٗ کی رائے اب ہم ایسی قد آور شخصیت کا حوالہ بھی شامل کر رہے ہیں جن کی فکر رسا کی پوری تاریخ اسلام میں کم ہی مثال ملے گی یعنی سیدنا حضرت امام اعظم ابو حنیفہ (۷۶۷ء م) کہ ان کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ

"وقفۂ ارتداد کے اعمال ضائع نہیں جاتے۔ نہ نکاح کی تجدید کی ضرورت ہے نہ عبادات کے اعادے کی"

(تفصیل ملاحظہ ہو امام طحاوی (۹۳۳ء م) کی "مشکل الآثار" طبع دکن جلد ۱/ ۶۵/ ۲ تا ۱۲۱)

امام ابو حنیفہ کی طرح علامہ عبد الرحمان الجزیری (۱۹۴۱ء م) فقہار کے ایک غیر اختلافی فیصلہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسی طرح ایک مسلمان کسی "مرتد" کو اپنا وکیل بنالے تو اس کے روا ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے"

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ترجمہ محکمہ اوقاف پنجاب جلد ۲/ ۱۷۵/ ۱۴ تا ۱۵)

یہاں۔ الجزیری فقہار کے حوالے سے واضح فرماتے ہیں کہ۔ ایک "مرتد" کسی مسلمان کے تمام امور کو سرانجام دینے کا مختار نامہ بغیر کسی فقہی اختلاف کے حاصل کر سکتا ہے اور اس مختار نامہ کی نوعیت کوئی سی ہو اس سے فرق نہیں پڑ سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر فقہار بھی کسی مرتد کے جسمانی سزا سے دوچار کرنے یا اُسے موت کی دہلیز تک پہنچانے کے قائل نہیں تھے لیکن روادار ی اور ہماہمی کی منطق نے انہیں بعض کوتہ نظروں کی ہمنوائی پر مجبور کر رکھا تھا کہ وہ "مرتد" کے بارے میں غیر اخلاقی فیصلوں پر صاد کریں کیونکہ "مختار نامہ" کا اصول واضح کرتا ہے کہ۔ "ارتداد" کی سزا اگر قتل ہو یا اس کے باعث

عمل ضائع جاتے ہوں تو مرتد۔ کسی مسلمان کے ہمہ امور کا نگران کیسے ہوسکتا ہے؟

ان اقتباسات کی ضوء میں - اعمال کے ضیاع کا مفہوم ہمیشہ یہی لیا جاتا رہا ہے کہ ——— ارتکاب کنندگان کی اچھائیاں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتیں - ان کی محنت اکارت گئی ——— جو کیا اس پر پانی پھر گیا ——— وہ اگر زندگی کا ناگوار شیوہ نہ اپناتے اور مقابل میں ان سچائیوں اور اچھائیوں کو اختیار کرتے تو یقیناً فائدے میں رہتے - اس کی مثال ایسے ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ——— فلاں طبقے یا گروہ کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہماری پچیس(۱) سالہ جہد آزادی اکارت ہو گئی اب "اکارت گئی" کی سزا یہ نہیں ہو سکتی کہ اس کے ذمہ دار طبقے یا گروہ کو پھانسی لگا دیا جائے؟ اگر ایسا ہوتا تو مسلم لیگ اور فوج کی نسل ہی ختم ہو جاتی - لہذا اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آئندہ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ ایسی پالیسی پہ گامزن ہوں جو اس نقصان اور خسارے کی تلافی کر سکے - عربی میں "حبط"

اس گھاس کو کہتے ہیں جسے چرتے ہی جانور کا پیٹ پھول جائے اور اس پہ اس کی موت واقع ہو سکتی ہو -

(اساس البلاغۃ علامہ زمخشری طبع مصر صے۲ کالم ۱)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر عملِ باطل جو اچھائیوں کو لے ڈوبے عربی میں اسے "حبط عملہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے وحیِ الٰہی نے اِسے مختلف پیرایوں میں سولہ مقامات پہ استعمال فرمایا ہے مگر کسی بھی مقام پہ - اس کی سزا گردن زدنی ارشاد نہیں فرمائی -

امام راغب معتزلی (۱۱۰۸ھ م) نے زیر بحث آیت اور اس کی ہم موضوع آیات کو نقل کر دینے کے بعد لکھا ہے کہ

---

(۱) طبع دوم ۱۹۷۳ء کے وقت

اعمال کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اگر تو وہ دنیادی نوعیت کے ہیں تو ان کے ضائع ہونے کے معنیٰ ہوں گے کہ آخرت میں ان کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ (مفردات راغب طبع مصر ص۱۰۴)

اور

"اگر ایسے اعمال کا تعلق آخرت سے ہے تو بھی ظاہر ہے کہ روزِ محشر ان کی سزا دخول نار ہی ہوگی۔ لیکن اعمال کی ایک تیسری قسم بھی ہے کہ اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ اعمالِ سیئہ بھی موجود ہیں اور مرنے والا اعمالِ سیئہ پر ہی مرا ہے تو اس وقت اعمالِ صالحہ کچھ بھی فائدہ نہ دے سکیں گے۔ لاحاصل ہوں گے۔

(حوالہ مذکور ص۱۰۵)

لغت اور ادب کے ان واضح اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ۔ادبیات و محاوراتِ قوم کے کسی بھی شناور نے "اکارتِ اعمال" کا یہ مفہوم کہیں بھی نہیں لیا کہ ارتکاب کنندہ کو "قتل" کر دیا جائے؟ یہ جسارت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جانبدارانہ شعور کے رنجور اور گروہی نظریات کے مریض ہیں اور جو ہر بات میں چاہتے ہیں کہ وحیِ الٰہی ان کی مریض "انا" کی تسکین کا سامان فراہم کرے اور وہ کہہ سکیں کہ: ھٰذا من عند اللہ

قتلِ مُرتد پر انوکھا استدلال

ہوش و خرد سے ناراض لوگوں کے ایک واجب الاحترام بزرگ علامہ احسان الٰہی ظہیر "بنی اسرائیل" کے مشہور واقعہ کے حوالہ سے بات کرتے ہیں کہ ـــــ انہیں بھی بچھڑا پرستی کی پاداش میں موسیٰ علیہ السلام نے حکم دے رکھا تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور۔ ۳ جون ۱۹۷۳ء ص۶)

حضور والا آپ تو ایک علامہ ہیں یہاں تو ایک ادنیٰ سا شعور رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ ـــــ ایک ایسی اکھڑ قوم جو لاڈ۔ دپیار سے احکام حاصل کرنے کی عادی بن چکی تھی اور نرم سے نرم احکام کو بھی بہلنے بنا کر ٹال دیتی تھی وہ یکایک اتنی فرماں بردار اور اتنی اطاعت شعار کیسے بن گئی کہ اتنا شدید حکم ملتے ہی ایک دوسرے کو قتل کرنے میں لگ گئی؟ پھر ایک دو اسرائیلی بھی نہیں ـ کہتے ہیں کہ موسیٰ کے اشارہ ابرو پہ ستر ہزار یہودیوں نے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ ڈالیں اور خداوند "یہود" اس خونی ڈرامہ کا بذاتِ خود تماشہ کر کے خوش ہوتے رہے

یہ تشریح ایک احمق ہی کر سکتا ہے ـ کیونکہ ہر قوم کی "ادبیات" کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور وہ اپنی ادبیات کے لئے ایسا مفہوم متعین کرنے کی مجاز ہے جس کی عقل وشعور اجازت دیتے ہوں اور لسانی تقاضے اس کے مؤید ہوں ـ بنی اسرائیل کو اگر " فاقتلوا انفسکم " (بقرہ ۵۴) کے صیغے سے خطاب کیا گیا تھا، تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس تھا کہ " اقتلوا " کا ایک " ادبی " مفہوم بھی ہے جسے یہ لوگ بخوبی جانتے تھے ـ یعنی ـــــ اعمال پر لعنت وملامت کے اسلوب کو " قتل " کے روپ میں واضح کرتے تھے ـ بلکہ جہاں قرائن کی بہتات ہوتی تو وہاں " پھٹکار ودھتکار " کے سوائے کوئی اور مفہوم ان کے ذہن میں آہی نہ سکتا تھا[1] یہاں تو ایک پیشگی قرینہ " توبوا الیٰ بارئکم "

---

(۱) قرآن پاک میں ہے " قتل الانسان ما اکفرہ " انسان پہ پھٹکار ہو کتنا ہی ناشکرا ہے (عبس ۱۷) (مفردات القرآن طبع مصر ص۴۰۱ تاج العروس طبع خیریہ مصر جلد ۸/۷۵) نیز فرمایا " قتل الخراصون " اندازہ کرنے والوں پہ لعنت ہو (ذاریات ۱۰ ـ مفردات ص۴۰۱) اور کہ ـ " قتل اصحاب الاخدود " خندقوں میں آگ بھرنے والے ذلیل ہو گئے (بروج ۴) ـــــ

کا بھی ہے جو مجرموں سے معافی طلب کرنے ہی کا متقاضی ہے اور معافی وہی طلب کرنے گا جو زندہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرا قرینہ۔ اللہ کی صفت توابی اور رحیمی ہے جس نے بات کو مزید صاف کر دیا کہ ـــــ اللہ کی رحمت اور درگذر کا تعلق انسان کی توبہ اور اصلاح سے ہے۔ موت کی صورت میں اللہ کی رحیمی اور توابی کا مثر ـــــ نامعلوم ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ مجرم کی اصلاح بھی ایک موہوم سی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔

معاہدات کی نوعیت مودودی نقطۂ نظر سے

مولانا مودودی صاحب "معاھدات" کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"یہاں عہد شکنی سے مراد کسی قسم کے معاہدات کی خلاف ورزی نہیں

✓ ان مقامات پر "قتل" کے معنیٰ مار ڈالنے اور گردن اڑا دینے کے نہیں ہیں صرف محاوراتی اور ادبی مفاہیم داخل کیے گئے ہیں۔ تاج العروس نے یہ بھی لکھا ہے " قتل الشراب اذا مزجه بالماء قال حسان رضی الله عنه

ان التی ناولتنی فرددتها
قتلت قتلت فهاتها لم تقتل

"پانی ملا کر تیزی کو کم کرنے پر بھی "قتل" کا اطلاق ہوا ہے۔ ثناخوانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسان بن ثابت (۶۷۴ء م) رضی اللہ عنہ کا شعر ہے جس نے مجھے شراب کا پیمانہ پیش کیا ــــ میں نے لوٹا دیا اور کہا کہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ ذلیل کرے۔ یہ تم نے کیا ستم ڈھا دیا کہ۔ شراب میں پانی ملا دیا۔ اب جاؤ وہ شراب لاؤ جو خالص ہو پانی ملا نہ ہو"

(تاج العروس طبع خیریہ مصر جلد ۸/ ۷۵/ ۱۵ تا ۱۷)

بلکہ سیاق عبارت سے واضح طور پر اس کے معنٰی "اقرارِ اسلام"
سے پھر جانے کے متعین ہوتے ہیں۔ دوسرے کفر کے لیڈروں
سے جنگ کے معنٰی بھی واضح ہیں کہ تحریکِ ارتداد کے لیڈروں
سے جنگ کی جائے (۱)

مودودی اخلاقیات کا ہی کمال ہے کہ وہ اسلام اور قرآن جیسی روشن حقیقت کو مسخ کر کے اپنے ڈھب کے مطابق پیش کرنے میں خصوصی مہارت کا نمونہ رکھتی ہیں۔ ان میں "قتلِ مرتد" کو چونکہ بنیادی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے لہٰذا جہاں اور جب بھی اس موضوع پہ سخن دانی فرمائی تاویل و تحریف کے پٹ کھل گئے۔ اب فرض کرو کہ وہ سیاسی معاہدے نہیں تھے۔ اقرارِ اسلام ہی کے معاہدے تھے۔ تو کیا اس سے مترشح نہیں ہوتا کہ ——— لوگوں سے اقرارِ اسلام پہ "جبری" معاہدے کرائے جاتے تھے؟ تو کیا اس مکروہ تصور کی موجودگی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیتِ مقدسہ داغدار نہیں بنائی جا رہی ——— ؟ پھر یہ خوب کہی کہ۔ معاہدے اقرارِ اسلام کے ہوتے تھے۔ کیا اسلام کا اقرار کرنے کے بعد بھی مسلمانوں سے معاہدوں کے ناطے سے معاشرت کی جاتی تھی؟ (یہ عجیب منطق ہے؟)

نیز اگر یہ سیاسی معاہدے نہیں تھے تو کیا ان معاہدوں کی رو سے صلح حدیبیہ کے موقع پہ اسلام یا اسلام کے ایک اہم رکن حج سے دستبردار ہونے کا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ذمہ دار نہیں گردانا جائے گا؟ ——— العیاذ باللہ ——— حقیقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کی اخلاقیات جھوٹ فریب اور مفروضوں کا پلندہ ہے۔ آپ دیدہ دانستہ اپنے مفروضوں کو اسلام کا نام دے کر اپنی خام کاریوں میں وحیِ الٰہی کو شامل کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

---

(۱) نوائے وقت ۳ جون ۱۹۶۳ء ص ۲)

باب دوم

قتلِ مُرتد کا بُنیادی مآخذ

فنی تحلیل اور تجزیے

مرتد کے بارے میں قرآن پاک نے جو پالیسی واضح کی ہے اس کی تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ اس کے باوصف اپنے کو مسلمان کہنے والے اگر یہ عقیدہ بھی رکھیں کہ ـــــ قرآن پاک ہدایت کے باب میں ناکافی ہے اور اس کے لئے روایات اور فقہاء کے فیصلوں کی طرف رجوع کرنا لازمی ہے۔ تو ایسے لوگوں کو ہمارا جواب یہ ہے کہ سلف نے وضعی احادیث کے ضمن میں ایسی بھی روایات کو مسترد کر دینے کا مشورہ دیا ہے جو۔

قرآن پاک کے خلاف ہوں(۱) ـــــ مشاہدہ ان کی تائید سے قاصر ہو(۲) ـــــ اور مشہور تاریخ انکی تصدیق نہ کر سکتی ہو ـــــ اب اگر وہ لوگ قرآن پاک کو فقہ اور حدیث کے مخالف ہونے کی صورت میں تسلیم نہیں کرتے تو وحیِ الٰہی پہ ایمان رکھنے والے بھی اُن روایات کو تسلیم کرنے کے پابند نہیں ہو سکتے جو قرآن پاک کے

(۱) المنار تصنیف ابن قیم الجوزیہ طبع مصر ص۳۱ سطر ۱۱ (۲) المنار ابن قیم ص۲۹ سطر ۲۰

صریحاً خلاف ہوں - اور یہ بات ہم اپنے جی سے نہیں کہتے - نفسیاتِ مناظرہ کا شعور رکھنے والے مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ (۱۵-اپریل ۱۸۸۰ء) نے بھی سر سید (۱۸۹۸ء) مرحوم کے اس اعتراض کو تسلیم کر کے ہماری تائید کا سامان فراہم کر دیا ہے کہ ـــــ جو حدیث قرآنِ پاک کے خلاف ہو وہ قابلِ تسلیم نہیں ہے (بحوالہ تصفیۃ العقائد - طبع دیوبند)

پس جب فقہِ حنفی کے جید اکابر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ حدیث قرآن پاک کے خلاف ہو سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایسی احادیث کی بات گفتگو کا دروازہ ہی بند کر دیں - ؟ خاص کر جب یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ روایات و احادیث کا تعلق اگر عبادات و احکام سے ہے تو اُن میں سے بیشتر میں فقہا اور محدثین کے گروہی افکار کا عکس جھلکتا ہے - اس طرح اگر عقائد و ایمانیات کے باب سے ہوں گی تو وہاں بھی اشعری، ماتریدی، سلفی، معتزلی حشوی اور مرجیہ مدارس فکر میں بٹی ہوئی ملیں گی - اور اگر سیاسی نوعیت کی ہوں گی تو بھی بنو امیہ، بنو علی، بنو عباس کے مناقب و مثالب کے علاوہ شیعہ خوارج اور بعد میں اہلِ سنت کے گروہی مفادات کی ترجمان ہوں گی - ایسے میں ایک جویائے حقیقت کے لئے منزلِ مقصود تک پہنچنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ ناممکن بھی ہے - کیونکہ ہر گروہ اسی روایت کو اعتماد و ایقان کا محور بنالے گا جو اس کے گروہ کے اکابر کے معیار کے مطابق ہو گی کلُّ حزبٍ بما لدیھم فرحون ۔ اور بہت کم ایسی روایات ہیں جنہیں امت کے سبھی لوگوں نے بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہو گا جیسے نماز کے اوقات - فرض نمازوں کی رکعتیں ـــــ ہر رکعت میں ایک قومہ - ایک رکوع اور دو سجدے - اور ہر دو رکعت کے بعد ایک التحیات کے لئے قعود ـــــ اور ہر چار رکعت

کے لئے چار قوموں - چار رکوعوں، آٹھ سجدوں اور دو التحیات کی تعداد - یا مغرب کی تین رکعتوں میں دو التحیات کا شمار بلا شبہ سائنٹیفک حیثیت سے غیر اختلافی حقیقتیں ہیں اِن سے انکار حقیقتِ دین سے ناآگہی کی دلیل ہے۔ کیونکہ یہاں "تواترِ عملی" نے شک و شبہ کا دروازہ بند کر رکھا ہے لیکن اِن کے علاوہ کتنی ایسی روایات ہیں جنہیں "تواترِ عملی" کی توانائی حاصل ہے؟ اور یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے کہ احادیث بنائی گئی ہیں۔؟ بلکہ ضرور بنائی گئی ہیں اور مشاہدہ گواہ ہے کہ - فرقہ واریت کی اساس یہ تلاش کردہ احادیث نے امتِ اسلام کے مزاج میں ایسی تلخی گھول دی ہے کہ مسلمانوں کا شیرازہ ہمیشہ کے لئے بکھر کر رہ گیا ہے نہ صرف یہ کہ واعظ اور قصہ گوؤں نے زیبِ داستاں کے لئے وضعِ حدیث کا بازار گرم رکھا ہے اہلِ تقویٰ نے بھی اِس صنعت کو بامِ ترقی پہ پہنچا کر ایک گونہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس کو (جو ناقابلِ تقسیم "وحدت" کی حیثیت رکھتی تھی اسے فرقوں اور گروہوں میں بانٹ کر ـــــ مقصدِ رسالت کو شدید زک پہنچائی ہے غرضیکہ حدیثیں بنیں سب نے بنائیں اور پرہیز کسی نے بھی نہیں کی۔ بلکہ ماضی اور حال میں جب بھی حاملینِ مذاہب نے اپنے اپنے گروہی احساسات کے تحفظ کے لئے دفاعی حصار بلند کرنا چاہا تو انہیں اس کی تعمیر کے لئے حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ"(۱) نے زیادہ سے زیادہ تعمیراتی مسالہ فراہم کیا ہے - میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ حصار کس حد تک ان کا دفاع کر سکا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ قدیم خواہ جدید حاملینِ مذاہب نے اس حدیث کو "مذہبی فرانس"

---

(۱) جو اپنا مذہب یا نظریہ تبدیل کرے اسے قتل کر دو -

کے لئے "منیجنو لائن"[1] سے زیادہ محفوظ تصور کر رکھا تھا اس کی "ضَو" میں وہ یہاں تک عقیدہ رکھنے لگے تھے کہ سورۂ نسار کی (۹۰ ویں) آیت جس نے "پُرامن مرتد" کے لئے ہر قسم کا پروانۂ امن عطا کر رکھا تھا۔ اُن کے نزدیک وہ بھی حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ" سے نہ صرف بے اثر اور ناقابلِ رجوع بن چکی تھی منسوخ اور مسترد بھی قرار دے دی گئی تھی۔

کیا یہ حدیث وحیِ الٰہی کے واضح اور ناقابلِ تاویل حکم کو منسوخ کرنے کی صلاحیت واقعتاً رکھ سکتی ہے؟ اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا۔ پہلے یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ زیرِ بحث حدیث جو قتلِ مرتد کے لئے قطعی حیثیت سے پیش کی جاتی ہے اس کی اپنی صلاحیت اور استعداد کار کتنی ہے؟

مجھے احساس ہے کہ میں آج کی صحبت میں حاملینِ مذاہب کی بیسیوں دفاعی لائنوں میں سے چند ایک کا جو اُن کے اپنے ہی نقطۂ نظر سے ناقابلِ تسخیر تھیں۔ انتخاب کر کے دلائل کی توانائیوں سے نشانہ بنا رہا ہوں اس سے احاطہ اگرچہ مقصود نہیں ہے تاہم ان مزعومہ حفاظتی اقدامات کی مضبوطی کا جائزہ لیتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ حاملینِ مذاہب۔ بین الملّی روابط اور احترامِ ادیان کی تعلیم سے کس قدر بے بہرہ اور نابلد محض تھے؟ حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ" محدثین کے نزدیک اپنے مفہوم میں ــــ واضح اور غیر مبہم ہے کہ ــــ مذہب تبدیل کرنے والے کو قتل کر دیا جائے۔ اِسے بخاری، ابوداؤد ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، طبرانی اور بہت سے دیگر محدثین نے مختصر اور تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اسی ہی حدیث کے سہارے تمام محدثینِ کرام کے ذہنوں میں

(۱) جنگ عالمگیر دوم میں فرانس کو محفوظ کرنے کے لئے جنگی ساز و سامان سے لیس منیجنو لائن کے نام سے ایک دفاعی پٹی قائم کی گئی تھی جس کی بابت ماہرین کا خیال تھا کہ ناقابلِ تسخیر ہے مگر ہٹلر کی افواج نے تابڑ توڑ حملے کر کے فرانس کا بھرتہ نکال دیا اور یہ لائن کسی کام نہ آسکی۔

یہ بات سمائی ہے کہ ـــ " تبدیلیٔ مذہب " کی سزا بالآخر گردن زدنی ہے اب یہ کون بتلائے کہ " عقیدۂ تبدیل کرنے کے حدود کیا ہیں؟ مرتد کی علمی اور قانونی تعریف کون سی ہے؟ اور موت سے کم سزا کی گنجائش ہے کیونکہ اکثر اوقات میں تعصب اور تقلید کی راہ چلنے والوں کا چونکہ زور رہا ہے لہٰذا انہوں نے اپنی مصنوعی اکثریت کے بل بوتے پر " مرتد " اور محارب میں جو امتیازی خط ہے اسے اڑا کر ہمہ قسم مرتد کو واجب القتل ٹھہرا دیا ہے۔ اور یہ انتہا پسندی چونکہ اپنے اندر اخلاقی اور قانونی حیثیت بنا ہی نہیں رکھتی تھی لہٰذا بلا تفریق ہر مخالف کو کافر قرار دیا گیا یا مخالف کے عقیدے کا اپنے جی سے تعین کر کے واجب القتل ٹھہرایا گیا۔ کیونکہ آگ اور خون کی ہولی سے دلچسپی رکھنے والے عناصر ہمیشہ اُلّوؤں کی طرح کھنڈرات کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

غنچہ و گل کو کیا اماں دو گے ـــ گدلیاں بو رہے ہو گلشن میں
خون و بارود اور گھٹن کے سوا ـــ کیا سمیٹو گے اپنے دامن میں

قتلِ مُرتد، سیاسی حیثیت سے

پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ " قتلِ مرتد " کا مسئلہ جذباتی سے زیادہ " سیاسی " حیثیت رکھتا ہے۔ اب مقام کی مناسبت سے اُن اسباب و عوامل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اس کے پس منظر میں جو ہاتھ کارفرما تھے اور جن کی واضح طور پر نشاندہی نہیں کی جا سکی۔ ان کی واضح نشاندہی کی جا رہی ہے کیونکہ جب تک اسباب و علل کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا حقیقت کی تہ تک پہنچنا آسان نہیں ہو سکتا اور یہ سراغ رسانی ہمارے دماغ کی اختراع نہیں اُن محدثین کے اصولوں اور نظریات کے گہرے مطالعہ کے نتیجہ میں حاصل شدہ معلومات پر مبنی ہوگی جو حدیث شناسی میں خصوصی مذاق رکھتے تھے ـــ یہ محدث حضرات

عقائد وافکار کے لحاظ سے کچھ بھی ہوں اُن کے حدیث پرکھنے کے بعض اصول اور ضوابط سائنٹیفک حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان سے استفادہ نہ کرنا بڑی زیادتی ہوگی۔

ان حضرات نے برملا۔ اس بات کا اظہار فرمایا ہے کہ۔ اہلِ بدعت نے اپنے مسلک کی تائید میں احادیث کی وضع تراش کی ہے بلکہ ثقہ راویوں کے توسط سے بھی کی ہے۔ اب ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اہلِ بدعت سے مراد صرف شیعہ اور خارجی ہی ہو سکتے ہیں[1] کیونکہ سیاسی اور گروہی بنیادوں پر اُن لوگوں نے بھی صنعتِ حدیث گری میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جن کی وابستگیاں گروہِ محدثین سے تھیں تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فکری قیادت کے پیروکار تھے اور جو اس سے منحرف تھے انہوں نے بھی ایک دوسرے کے حریف ہونے کی حیثیت سے سیاسی احادیث کو جنم دیا۔ پالا پوسا اور چپکے سے امتِ اسلام کے ذہنوں کو اپنی سیاست سے تہ و بالا کر دیا تھا۔ اس گروہ کے دو گروپ تھے ایک باغی جسے خارجی۔ کے لقب سے پکارا جاتا تھا اور دوسرا محبانِ علی جنہیں عرفِ عام میں شیعانِ علی کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں گروپ بنیادی طور پر ایک ہی کردار کے گرد گھومتے تھے مگر اپنے اپنے گروپ سے وفاداری کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے حمایت خواہ مخالفت میں احادیث کا سہارا لینا بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر جنگِ جمل (۳۶ھ ۶۵۶ء) کے موقع پر ضرورت لاحق ہوئی کہ حضرت عائشہؓ کو سیاسی افق سے ہٹا دیا جائے یا آپ کے سیاسی

---

(۱) اسلام میں سب سے قدیمی سیاسی پارٹی سیدنا علی علیہ السلام کے پیروکاروں کی ہے جسے شیعانِ علی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور دوسری خوارج کی جو پہلی پارٹی سے ردّ ہو کر علیحدہ وجود سے متعارف ہوئی تیسری پارٹی سنیوں کی ہے جو سب سے بعد میں اور تقریباً ۵۰ سال گذرنے پر وجود میں آئی

موقف کو کمزور کر دیا جائے تو اس غرض

کے لئے یہ حدیث تلاش لی گئی کہ "لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ"

"وہ قوم فلاح و کامرانی سے ہرگز ہمکنار نہیں ہو سکتی جس نے

عورت کی قیادت قبول کی" (بخاری)

اس حدیث کو پیش کرنے والے حسن بصری تھے جن کے بارے میں مشہور ہے کہ۔

نشأ فی کنف علی بن ابی طالب ؛

یہ حضرت علی کی آغوشِ تربیت میں جوان ہوئے تھے۔

(حلیۃ الاولیا، طبع مصر جلد ۲/ ۱۳۱)

اور تاریخ و سیرت نگار ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ۔ یہ حسن جنگ جمل کے موقع پر تلوار لے کر عائشہؓ کے خلاف لڑے بھی تھے۔ جس سے اس کے سیاسی مسلک کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے(۱) اور اب اس حدیث کی دایہ گری میں کتنے ہی مقدس ہاتھوں سے کیوں نہ کام لیا گیا ہو اور بخاری کی چوٹی کی حدیثوں میں اس کا شمار کیوں نہ ہوتا ہو؟ اس کی حیثیت خالص "سیاسی" نوعیت کی ہوگی اور اس ہی حیثیت سے اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ صحابہ کی افسانوی جنگوں کو اگر آپ حقیقت سمجھتے ہیں تو پھر آپ کو یہ اعتراف بھی کرنا ہوگا کہ گروہی اور سیاسی بنیادوں پر خارجیوں نے بھی دو چار ایسی حدیثوں کو وجود بخشا تھا جو حضرت علیؓ کے موقف کو زک پہنچانے کا کام دے سکتی تھیں۔ اور یہاں بھی ہم محدثین کے دیئے ہوئے اصولوں اور ضوابط کی روشنی ہی میں سراغ لگا سکتے ہیں کہ حدیث "من بدل دینہ" کیوں سیاسی ہے؟

---

(۱) تفصیل ملاحظہ ہوں میری کتاب "عورت اور مسند امارت" طبع ادارہ ادبیات اسلامیہ نزد اقبال پارک ملتان۔

حدیث "من بدل دینه فاقتلوه" جس نے تاریخ اسلام کو ایک مخصوص مزاج عطا کر رکھا ہے اس کی وضع و ساخت میں جن مقدس لوگوں کا ہاتھ تھا ان میں جناب عکرمہ بن خالد (۷۲۳ء م) کا خصوصی کردار ہے یہ حضرت اگرچہ "خارجی" اخلاقیات کے لحاظ سے بڑے ہی پاکباز اور متقی تھے لیکن جانبدارانہ شعور نے کذب تراشی پہ مجبور بھی کر رکھا تھا جنگِ جمل (۶۵۶ء م) معرکۂ صفین (۶۵۷ء م) اور کارزارِ نہروان (۶۵۹ء م) نے امتِ اسلام کے ذہنوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا تھا اس سے شاید ہی کوئی فرد محفوظ رہ سکا ہو۔ عکرمہ بن خالد کا تعلق اُس سیاسی گروہ سے تھا جو معرکۂ صفین کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سیاسی وابستگیاں ختم کر کے اپنا الگ اور متوازی گروہ بنا چکا تھا۔ اور "**تحکیم**"(۱) کے جرم میں علی بن ابی طالب کو مرتد اور کافر قرار دے دیا تھا اور ان کا مطالبہ تھا کہ اگر ابن ابی طالب اپنے جرم سے تائب نہیں ہوتے تو ان کی سزا قتل ہے۔ نہ صرف اتنا ان لوگوں نے اپنے خفیہ پروگرام میں طے کر رکھا تھا کہ۔ اکیسویں رمضان (۶۶۰ء م ۴۰ھ) کی مقررہ تاریخ کو بیک وقت تین سیاسی قتل کئے جائیں گے کیونکہ گروہِ خوارج کے نزدیک نہ صرف علی علیہ السلام "تحکیم" کے باعث دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر واجب القتل ہو چکے ہیں۔ اس وقت کے تمام سربراہانِ مملکت بھی اسلام کے چشمۂ صافی سے دور ہٹ کر گردن زدنی ہو چکے ہیں چنانچہ کئی دنوں کے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس گروہ کے جانبازوں کا ایک گروہ مصر کے گورنر عمرو بن العاص (۶۶۴ء م) کو قتل کرنے مصر روانہ ہوا اور ایک دمشق تاکہ شام کے گورنر امیر معاویہ (۶۸۰ء م) کا کام تمام کر دے اور ایک گروہ عراق پہنچ کر ۲۱ رمضان المبارک کی مقررہ تاریخ پر حضرت علی کو زندگی کی حرارتوں سے محروم کرنے میں لگ گیا۔ دمشق والے کمانڈر نے منہ اندھیرے امیر معاویہؓ کے گھٹنوں پہ ضربات لگا کر شدید

(۱) ثالثی

طور پر مجروح کر دیا مگر حملہ آور دھر لئے گئے۔ اسی طرح مصری مجاہدوں نے عمرو رضؓ بن العاص کے نائب کو قتل کر کے یقین کر لیا کہ ان کا ہدف صحیح تھا(۱)۔ اب رہے سیدنا علی تو آپ کو "نجدہ" حروری گروپ کے ایک خارجی عبد الرحمان بن ملجم ۔ المرادی (سنہ ۴۰ھم) نے(۲) شہید کر ڈالا۔

اس طرح یہ تین قتل اس بنا پر ہوئے کہ دین میں تشدد کو پروان چڑھانے والے ایک سیاسی ہدایت کو حرز جاں بنا چکے تھے جو ان ہی دنوں وضع کی گئی تھی کیونکہ خارجی اپنے نظریئے کے مطابق دین کی وہی تعبیر تسلیم کرتے تھے جو تشدد اور تخریب کاری کے اجزا ر سے ترکیب پاتی ہو۔ ان ہی خارجیوں میں عکرمہ بن خالد (سنہ ۱۲۳ھم) کا نام سرِ فہرست آتا ہے جو خارجیوں کے سردار "نجدۃ" الحروری کا خصوصی شاگرد تھا اور افریقہ میں خارجیت کو پھیلانے کے لئے چھ ماہ تک نجدہ سے ٹریننگ لیتا رہا ہے۔ یہی عکرمہ اپنے مسلک کی تائید میں زیرِ بحث حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ" کو تراش کر لایا۔ جب کہ اس حدیث کا واقعۂ تحکیم سے پہلے کوئی تاریخی وجود نہیں تھا۔ عین موقع پر وضع ہوئی یا کچھ ہی عرصہ بعد سرکشی "تحکیم" کے جواز کے لئے بنالی گئی۔ کیونکہ اکثر تو "نظریہ" کی تخلیق کے ساتھ ہی حدیث بھی وضع کر لی جاتی تھی (جیسے عورت کی امارت کی مخالفت کے ضمن میں کہا گیا) اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ "نظریہ" تخلیق ہونے کے بعد بھی یہ کام سرانجام دیا جاتا۔ یا یہ کہ تائید در تائید کی غرض سے مختلف ادوار میں مختلف اشخاص سے تائیدی مواد فراہم کیا جاتا رہا۔

یہ بات کہ عکرمہ بن خالد خارجی تھے، حسب ذیل گواہوں کی زبانی بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔

(۱) اس صبح کو ابن العاص کی طبیعت ناساز تھی نماز ان کے نائب نے قائم کرائی تھی۔

(۲) جو سوءِ اتفاق سے حضرت علیؓ کے لے پالک بھی تھے۔

امام ذہبی (۷۴۸ھ م) نے فرمایا۔ عکرمہ بڑا قوی الحافظہ عالم باعمل تھا مگر خارجی ہونے کی وجہ سے اس کی باتیں پایۂ اعتبار سے گر چکی تھیں۔ امام علی بن المدینی (۲۴۹ھ م) اور یعقوب الحضرمی (۸۲۱ھ م) اس کے خارجی ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ یحییٰ بن بکیر (۲۴۵ھ م) کہتے تھے کہ۔ آفریقہ، مصر، الجزائر اور مراکش کے تمام خارجی عکرمہ ہی کے پیرو کار تھے۔ ابن المدینی نے ایک وضاحت میں یہ بھی فرمایا کہ۔ عکرمہ بنیادی طور پر نجدہ حروری کے دھڑے سے وابستہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب بن زبیر (۶۹۰ھ م) کہتے تھے کہ۔ عکرمہ پکا خارجی تھا (۱)

عکرمہ کے خارجی اور سرخیلِ خوارج ہونے کے بعد یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ۔ وہ سُنی عقیدے کے مطابق ایسے اہلِ بدعت میں سے تھے جن کے بارے میں امام مالک (۱۹۵ھ م) نے فرمایا تھا کہ۔

> چار قسم کے راویوں سے علمِ حدیث حاصل نہ کرنا چاہیئے ۱۔ سفیہ (گھٹیا قسم کے) لوگ جو اپنی ناشائستہ حرکات کا کھلم کھلا ارتکاب کریں ۲۔ جھوٹا شخص جو رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر اگرچہ جھوٹ نہ بولتا ہو۔ دوسروں پر جھوٹ بولنے والا بھی قابلِ اعتبار نہیں ۳۔ بدعتی جو اپنے خیالات پیش کرنے کے لئے حدیث کا سہارا لینے کا عادی ہو ۴۔ ایسا استاد جو زہد وعبادت میں تو اپنا ثانی نہ رکھتا ہو مگر اپنی روایت کے مضمون سے بے خبر ہو۔

(الکفایہ۔ خطیب بغدادی طبع دکن ۱۳۵۷ھ صـ۱۱۶/۱۵ تا ۱۹)

اس اقتباس میں امام مالک نے ایسے راوی کو رد کر دینے کا مشورہ دیا ہے

(۱) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال طبع سعادہ مصر جلد ۲/۲۰۸

جس کا تعلق اہل بدعت (خوارج) سے ہو اور خاص کر اس کی روایت جب اس کے مسلک کے تحفظ پر مشتمل ہو تو بادی النظر مسترد کر دینا چاہیئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (سنہ ۱۴۴۹ء م) دو قدم آگے بڑھ کر واضح فرماتے ہیں کہ۔

خارجی ہو یا رافضی یا کوئی اور بدعتی۔ اپنے مسلک کی تائید میں عمداً خواہ نیک نیتی سے جب کوئی حدیث بیان کرے تو وہ قابل عمل نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہ روایت ہی ایسی بیان کرے گا جو اس کے عقیدے اور خیال کو تقویت پہنچاتی ہو گی۔

(نزہتہ النظر طبع علیمی دہلی ص ۷۴)

اِن اصول وضوابط اور رد وقبول کے معیار کی روشنی میں عکرمہ کی یہ روایت اس قابل نہیں کہ اس پر فقہ اسلام کی باب بندی کی جائے۔

بُخاری کے راوی فرشتے نہیں تھے

کہا جاتا ہے کہ عکرمہ اہل ہوا میں سے ہی سہی اور یہ بھی بجا کہ سلف محدثین اور تابعی حضرات اس کی روایات کو مسترد کر دیتے تھے۔ مگر یہ رُواۃِ بخاری میں ہونے کے باعث اتنی سنگین سزا کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ وغیرہ

ہمارے نزدیک یہ معیار نظرِ ثانی کا محتاج ہے کہ ایک مجروح شخص بخاری کا راوی بنتے ہی تمام عیوب سے پاک وصاف تصور کر لیا جائے۔ بخاری کا راوی بننے سے نہ تو سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں اور نہ ہی ایک غیر معیاری شخص فرشتہ خصلت بن جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں اور محدثین کی مجبوری کا ہمیں احساس ہے کہ وہ کیونکر ایک حسب مطلب راوی کا دفاع کرنا ضروری سمجھتے ہیں؟ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی مرحوم (سنہ ۱۸۶۸ء م) نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

مجروح راویوں سے محدثین اس لئے بھی روایت لیتے تھے کہ وہ

رواۃ بخاری میں سے ہوتے تھے (اور بخاری کا بھرم رکھنا ان کے عقیدے میں شامل رہا ہے) جیسے عکرمہ مولےٰ ابن عباس وغیرہ۔

(الرفع والتکمیل طبع قدیم لکھنؤ)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ء) رُواۃِ بخاری کی بابت محدثین کی اندھی عقیدت کے ضمن میں فرماتے ہیں

دوسری طرف عامہ اصحابِ حدیث ہیں جنھوں نے اس باب میں ٹھیک ٹھیک تقلید کی وہی چادر اوڑھ لی ہے جو فقہا مقلدین کے سروں پر انہوں نے دیکھی تھی اور اسے پارہ پارہ کر دینا چاہا تھا۔ ان کے سامنے جونہی بخاری و مسلم کا نام آجاتا ہے بالکل درماندہ ہو جاتے ہیں اور پھر کوئی دلیل و حجت بھی انہیں اس پر طیار نہیں کر سکتی کہ کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں۔

(ترجمان القرآن طبع مدینہ پریس بجنور جلد ۲/ ۵۰۰/ ۱۶ تا ۱۹)

مولانا عبدالحیؒ، امام الہند اور محدثین کرام بخوبی جانتے تھے کہ عکرمہ کی ایسی پشتیبانی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ اسے دوسرے بھاری عیوب نے بھی گھیر رکھا تھا۔ پھر ابن الجوزی (۱۲۰۱ء) جیسے نقادانِ فن تو ایسے راویوں کو منہ لگانے پر امام بخاری کو بھی معاف نہ کرتے اور موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے صاف کہہ جاتے تھے کہ بخاری سے تسامح ہو گیا ہے۔ اِن حالات میں عکرمہ سے اس بنا پر تعرض نہ کرنا کہ وہ رُواۃِ بخاری میں سے تھے کج بحثی کی دلیل ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ عکرمہ اہلِ ہوا میں سے ہی سہی مگر زیرِ بحث روایت کا رشتہ اس کے مسلک سے نہیں جوڑا جا سکتا کہ اسے محدثین نے اتنے واضح

پسِ منظر کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے ۔

ہمارے نزدیک یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہے ۔ سیاسی اور نظریاتی پسِ مناظر کا معلوم کرنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے ۔ محدثین حضرات اگرچہ زیرِ بحث حدیث کو "گول مول" حیثیت سے پیش کرتے ہیں ۔ لیکن حدیث کے اطلاقات اور راوی کے چال چلن دگروہی نفسیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ حدیث کا پسِ منظر معلوم کرتے کے لئے راوی کا عقیدہ سب سے بڑی رہنمائی کر سکتا ہے خصوصاً حدیث کے اطلاقات سے اس کے سیاسی مزاج اور عمل دخل کا بخوبی پتہ لگ سکتا ہے اسے اگر محدثینِ کرام خود ہی سیاسی حیثیت کے تعین کے ساتھ پیش کرتے تو اس سے ایسی احادیث کی فعالیت اور تاثیر محدود ہو کر وسیع تر گرفت کے جوہر سے عاری ہو جاتیں لہٰذا انہیں غیر سیاسی لہجہ میں پیش کر کے موثر طور پر سیاسی مقاصد حاصل کرنا زیادہ موزوں تھا ۔

ناشائستہ عادات کے حامل راویوں کی روایت

حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ" جسے عکرمہ نے اپنے سیاسی مقاصد اور پارٹی مفاد کے لئے وضع کر رکھا تھا جہاں کہیں روایت ہوئی ہے اس کا بنیادی کردار عکرمہ ہی نظر آئے گا اس میں دوسرا ناقابلِ درگذر عیب یہ تھا کہ اتنے زہد و اتقار کے باوصف ناشائستہ عادات کا حامل بھی تھا ۔ اِدھر آپ امام مالک کی زبانی معلوم کر چکے کہ آپ سفیہ مزاج لوگوں کی روایات کو بھی مسترد کر دینے کا مشورہ دیتے تھے اور سفاہت عقیدے کی ہو خواہ عمل کی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ عکرمہ دونوں ہی کا حامل تھا ۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ م) نے وضاحت کی ہے کہ

فسق و فجور میں مبتلا راوی کی روایت کو مسترد کر دینے پر تقریباً سبھی

متفق تھے اور اسی ہی بناپر انہوں نے فقیہِ اعظم سفیان بن عیینہ (۸۱۴ھ)
کے یارِ غار ابو منذر (شیخ الحدیث) کی روایات کو مسترد کر دیا تھا کہ
وہ شاہد باز بھی تھا اور محدثِ اعظم عبدالوہاب ثقفی (۸۰۹ھ) کے
خوبرو لڑکے سے "ذوقِ عجم" کا مظاہرہ بھی کیا کرتا تھا جس پر اسے
بصرہ سے نکال بھی دیا گیا تھا (۱)

(الکفایہ - للخطیب ص۱۵۸/۴ تا ۸)

اس سے معلوم ہوا کہ راوی حدیث کے لئے فسق و فجور سے پرہیز کرنا لازمی ہے
لیکن عکرمہ بن خالد ایسے امور سے پرہیز کرنے کا عادی نہیں تھا وہ قمار باز بھی تھا (جو
کہ حرام ہے) اور گانے بھی سنتا تھا جو کہ ان ہی محدثوں کے نقطۂ نظر سے اہلِ ہوا
کا مشغلہ ہے۔ (میزان الاعتدال طبع مصر ۲/۲۰۹)

حدیث کی پوزیشن راویوں کے کردار سے متعین ہوتی ہے

محدثین اس بات کو تسلیم کرتے
ہیں کہ احادیث کی درجہ بندی (مثلاً۔ اصلیت، وضعیت، صحت وضعف) راوی
کے کردار سے تعلق رکھتی ہے راوی اگر معیاری اور اچھے چال چلن کا مالک ہے
راست گوئی اس کا شیوہ اور احتیاط اس کی خصلت ہے تو اس کی روایت توانا اور
قابلِ توجہ ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حدیث کے لئے ضروری ہے کہ
نفسیاتِ وحی کے خلاف بھی نہ ہو اور کہ ہر قسم کی جرح و قدح اور فنی اسقام سے
پاک بھی ہو۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ "قتلِ مرتد" کے اتنے اہتمام
کے باوصف جس حدیث کو بنیادی ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تمام محدثین

---

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ راویانِ احادیث میں ایسے بھی تھے جو درسِ حدیث کے ساتھ ساتھ ذوقِ عجم
کے رسیا بھی تھے ابن حجر نے سلیمان بن ارقم (تابعیوں کے ہمعصر اور ماسکے پوتے) کے بارے میں ابو عبداللہ انصاری ۲۱۵ھ
کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ دادا اور پوتا دونوں ہی اپنے خوبصورت تلامذہ کو تیر دوس سے مخصوص نہیں بنا لینے کے عادی تھے۔
(تہذیب التہذیب طبع دکن جلد ۴: ۱/۱۶۹)

ل کر بھی اس کا معیارِ صحت قائم نہ رکھ سکے کیونکہ اس کے بنیادی کردار عکرمہ میں تیسرا ابھاری عیب یہ بھی تھا کہ ۔ دیدہ و دانستہ جھوٹ بولتا تھا ۔ امام مالک نے جن اشخاص کی احادیث کو مسترد کر دینے کا مشورہ دیا ہے ان میں ان کو زیادہ رگیدا ہے جو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اکسپلائٹ کرنے کے لئے دیدہ و دانستہ آپ کا نام لے کر جھوٹ بولنے کے خوگر بھی ہوں ۔ اسی بنا پر ہی عبد اللہ بن مبارک اور امام مالک کہتے تھے کہ

" جھوٹے کی سزا یہ ہے کہ اس کی روایت ہی کو جھٹلا دیا جائے "

(الکفایہ صفحہ ۱۱۷/۱۶ تا ۱۷)

اور ۔ رافع بن اشرس بھی ایسا ہی کہتے تھے (" " سطر ۲۰)

محدثینِ کرام کے ان مشوروں کی روشنی میں عکرمہ کا چال چلن مشتبہ اور اس کی روایت کردہ حدیث ہمہ قسم روشنی سے عاری ہو جاتی ہے کیونکہ امامِ جرح یحییٰ بن سعید انصاری (سنہ ۸۱۳ء م) علی بن عبد اللہ بن عباس (سنہ ۷۳۶ء م) عطا بن ابی رباح (سنہ ۷۳۲ء م) اور صحابیٔ رسول ؐ ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضؓ (سنہ ۶۹۲ء م) کہتے تھے کہ عکرمہ ــــــ جھوٹی حدیثیں بنانے کا عادی تھا ۔

(کوکب دراری ۔ مقدمہ فتح الباری ۔ معرفت انواع العلوم ابو عمر دمشقی اور میزان الاعتدال طبع مصر جلد ۲/۸-۲۰۹)

امام مالک (سنہ ۷۹۵ء م) خود امام بخاری (سنہ ۸۱۰ء م) ابن المسیب (سنہ ۷۱۲ء م) ابن ابی ذئب (سنہ ۷۷۵ء م) اور مطرف بن عبد اللہ (سنہ ۷۰۶ء م) نیز کہتے تھے کہ ۔ عکرمہ کی روایات ناقابلِ اعتبار تھیں ۔ ان میں سے بعض تو اس کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے (میزان الاعتدال و مقدمہ فتح الباری)

اس بنا پر ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ۔ عکرمہ کی زیرِ بحث حدیث

"من بدل دینہ فاقتلوہ" بنادٹی ہے اِسے عکرمہ نے اپنے مسلک کی تائید کی غرض سے دانستہ وضع کیا - اور لاکھوں بے گناہ خلقِ خدا کو تہِ تیغ کرنے کا اہتمام کیا ہے اور "قتلِ مرتد" ایسی بنیادی تعزیر کے لئے ضروری تھا کہ اس سے متعلق تمام مواد ہمہ قسم کے شک و شبہ سے پاک و صاف اور قطعی ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ - اختلاف یا نظریاتی اختلاف کی اساس پر بے گناہ انسانوں کی گردنیں اتار دینے کا فتوے صادر کرنے والے اتنا بھی نہ کر سکے کہ - نفسیاتِ وحی کے جواب میں کم از کم کوئی معیاری حدیث ہی بنا لاتے -

حقیقت یہ ہے کہ قتلِ مرتد کی موجودگی میں "فلسفہ حریت" بالکل بے معنی ہو جاتا ہے اِس سے جہاں انسان کا ارادہ متاثر ہوتا ہے وہاں اسلام کی طرف راغب ہونے میں کوئی کشش بھی باقی نہیں رہتی ــــ ارتداد سے بجبر روکنا - یا - مرتد کو واصلِ جہنم کرنا ہی اگر مطلوبِ اسلام ہوتا تو ایسے بنیادی مسئلہ کے بارے میں وحیِ الٰہی پہل کر کے خود ہی کوئی وضاحت فرما دیتی - اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ درجنوں آیات تو انسان کے خود اختیار کردہ عقیدے میں مداخلت کرنے سے روکنے پر مشتمل ہوں انہیں تو نظر انداز کر دیا جائے اور ایک دو ایسی وضعی احادیث کی اساس پر لوگوں کو قرآن پاک کی عطا کردہ حریتِ فکر سے محروم کر دیا جائے جن میں نہ سند کی توانائی کی رمق ہے اور نہ متن کی رکاکت کا سدِ باب!

سند اور متن کی وضاحت

بخاری - باب، حکم المرتد والمرتدہ و استتابتہم کی ذیل میں فرماتے ہیں

حدثنا ابو النعمان محمد بن الفضل حدثنا حماد بن زید عن ایوب عن عکرمۃ قال اتی علی رضی اللہ عنہ بزنادقہ فاحرقہم فبلغ ذالک ابن عباس فقال لو کنت انا - لم احرقہم

لنہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لا تعذبوا بعذاب اللہ ولقتلتہم لقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بدل دینہ فاقتلوہ۔

(بخاری مع فتح الباری طبع سلفیہ مصر جلد ۱۲/ ۲۶۷ حدیث عـ۶۹۲۲)

"عکرمہ کہتا ہے کہ حضرت علی کے پاس "زنادقہ" لائے گئے آپ نے ان کو آگ میں جلوا دیا۔ لیکن جب ابن عباس تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے کہا کہ اگر میں ہوتا تو انہیں جلانے کی بجائے قتل کر دیتا۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جلانے سے رد کا اور مرتد کے قتل کرنے کا حکم دیا ہے"

(بخاری مشکول طبع مصر جلد ۹/ ۱۰)

یہ حدیث واضح مفہوم نہیں رکھتی

عکرمہ کی یہ حدیث اور آگے چل کر معجم طبرانی (عـ۹۷۱ م) کی ہر دو روایات میں فنی رکاکتوں کے علاوہ مضمون کا سقم بھی نمایاں ہے۔ کیونکہ اِن احادیث کی ابتدا رحرف "مَنْ" سے ہوئی ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی جو شخص بھی اپنا نظریہ تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔ اب ظاہر ہے کہ راوی نے جس حرف کا سہارا لیا ہے وہ قطعی اور مطلب برآری کے قابل نہیں ہے لہٰذا اس سے فوجداری کی ایک اہم تعزیر کے لئے رجوع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ــــ جو یہودی مسلمان ہو جائے یا جو مسیحی یہودیت قبول کر لے۔ انہیں بھی قتل کر دو۔ اور یہ مفہوم نہ صرف ہمارے ذہن میں کھٹکا ہے۔ دبستانِ شافعی کے درخشندہ ستاروں نے بھی اس خامی کو محسوس کیا ہے۔ ابنِ حجر لکھتے ہیں وتمسک بہ بعض الشافعیۃ فی

قتل من انتقل من دین کفر الی دین کفر

"بعض شافعیوں کا "مَنْ" سے استدلال ہے کہ ـــ جو شخص کسی بھی دینِ کفر کو چھوڑ کر دوسرے دینِ کفر کو اختیار کرے اسے بھی قتل کر دیا جائے"

(فتح الباری طبع سلفیہ مصر جلد ۱۲/۲۷۲/۱۷)

بات کیا ہوئی کہ نظریات تبدیل کرنے کی سزا غیر مسلموں کو بھی دی جا سکتی ہے۔

اس حدیث کے متن کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس میں "زنادقہ" کو "مرتد" کے مفہوم میں لیا گیا ہے جب کہ لغت اور ادب ایسی دھاندلی کو گوارا نہیں کر سکتے خاص کر "زنادقہ" کی تشریح و تعبیر میں جو اسلوب ابنِ حجر نے اختیار کیا ہے وہ تو دلیدہ فکری کا شاہکار بھی ہے۔ غیر مصدقہ اور اہلِ زبان کے نقطۂ نظر سے غیر متفقہ بھی ہے۔

اور تیسری خامی یہ ہے کہ۔ عکرمہ نے اس آدمی کا نام ظاہر نہیں کیا جس نے حضرت علی کے کردار کی ابن عباس کو خبر دی۔ ابن حجر لکھتے ہیں۔ لم اقف علی اسم من بلغہ

ابن عباس تک خبر پہنچانے والے کا نام ظاہر ہونا چاہیئے لیکن باوجود جستجو اس کے نام کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔

(فتح الباری جلد ۱۲/۲۷۱/۲۲)

اور جب ایک واسطہ کا نام ہی معلوم نہیں تو اس کے کام یہ آگاہی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے پاس زندیق کو مرتد بنانے کی سند کیا تھی؟ شاید کہ وہ بھی عکرمہ کی طرح سازش کے عناصر میں سے کوئی گمنام عنصر ہو۔ کیا اس کی صفائی میں کچھ کہا جا سکتا ہے؟

اور چوتھی خرابی یہ ہے کہ یہ حدیث وضعی ہونے کے باوصف واضح نہیں مجمل ہے لہٰذا "مفہوم" کے لحاظ سے "غیر قطعی" ہے کیونکہ "مرتد عورت" اس سے مستثنیٰ ہے نیز تادیلی مرتد بھی اس کے اطلاق سے خارج ہے (۱)

اور "قاعدہ" یہ ہے کہ

جو چیز کسی بھی مرحلہ پر استثنار کی متحمل ہو وہ قطعی نہیں رہتی۔ اس میں یکے بعد دیگرے کئی استثنائی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں مثلاً ایک شخص مرتد تو ہے مگر موحد ہے۔ خدائے لاشریک پر اس کا ایمان ہے اسے بھی مستثنیٰ ہونا چاہیئے۔ لہٰذا غیر قطعی احکام پر "قتلِ نفس" جیسے وحشیانہ فیصلوں کی تفریع نہیں کی جا سکتی (۲)

عنکبوتی سہارے یا معاون سندیں؟

جس طرح کمزور دیوار کو پشتے دے کر کچھ عرصہ کے لیے خطرے سے محفوظ بنایا جاتا ہے اسی طرح محدثینِ کرام بھی جب محسوس کرتے کہ ان کی ماخذ کی احادیث میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں تو وہ دائیں بائیں کچھ سہارے دے کر ایسی احادیث کو زندہ رکھنے کا اہتمام کر جاتے ہیں چنانچہ زیر بحث حدیث "من بدل دینہ فاقتلوہ" کے بارے میں جب انہیں محسوس ہوا کہ ہر مقام پر عکرمہ جیسا نظریاتی شخص ہی اس کا بنیادی کردار ہے ۔ جسے ابتدائی طور پر اگرچہ امام بخاری کا بھرم رکھنے کے لئے قابلِ اعتماد گردانا گیا ہے تاہم یہ سحر ایک دن ٹوٹ کر رہے گا اور عکرمہ ہی کی

(۱) ملاحظہ ہو۔ نووی شرح مسلم طبع اصح المطابع دہلی ص۳۹ (۲) سرسیدؒ نے نفسیاتِ مذہب کی نشاندہی کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا ہے کہ

"اور خود مذہب نے جو خون ریزی اور بے رحمی اور نا انصافی اور درندوں سے بھی زیادہ بدتر خصلت دکھلائی وہ شاید دنیا میں بے مثل ہو گی"

(تفسیر سید طبع ۱۸۹۱ء جلد ۱/۲۵۱/۱۲ تا ۱۴)

شخصیت ڈائنامیٹ کا کام دے کر" قتل مرتد " کے طلسمی ہیکل کو بھک سے اڑا دے گی یعنی عکرمہ کے جن پتوں پر تکیہ تھا وہی ہوا دینے لگ جائیں گے۔ تو انہوں نے پشتیبانی کے فرائض سے کام لیتے ہوئے کچھ اور سہارے بھی کھڑے کرا دیئے مقصد یہ تھا کہ اس طرح متلاشی حقیقت کو باور کرایا جاسکتا کہ۔ نظریہ "قتل مرتد" کی ضرور کوئی اصلیت ہے لیکن وہ بھول گئے کہ جو سہارے توانائی کے عنصر سے خالی ہوں ان پر اعتماد و ایقان کی عمارت کیوں کر استوار کی جا سکتی ہے؟ پھر جو سہارے تلاش کئے گئے ہیں ان کی حیثیت اگر قابلِ توجہ ہوتی تو محدثین کرام بیک کر انہیں بھی بنیادی راویوں میں شامل کر لیتے اور یوں " من بدل دینہ " کی عکرمہ کے روپ میں جو شامت آگئی تھی وہ ٹل جاتی۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور وہ بجا طور پر انہیں الگ رکھ کر متلاشی حقیقت پر اپنا بھرم نہ کھولنا چاہتے تھے۔ اس وضاحت کے بعد امام طبرانی (۳۶۰ھ م) سے ملئے انہوں نے "معجم کبیر" میں ایک سند یوں بیان کی ہے۔ بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ معاویۃ بن حیدہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من بدل دینہ فاقتلوہ؟

(بحوالہ "نصب الرایہ طبع مصر جلد ۳/۴۵۶)

جرح اس سند کا بنیادی راوی۔ بہز بن حکیم (۱۶۰ھ م) ہے جو اپنے دادا معاویہ سے روایت کرتا ہے۔ جس کے بارے میں امام حاکم (۱۰۱۴ھ م) کی تحقیق یہ ہے کہ

بہز کی روایت اپنے والد حکیم کے واسطہ سے جو خود دادا معاویہ کے ذریعہ سے دونوں صورتوں میں " متابع " کے بغیر ہی ملے گی یعنی تنہا بہز ہی ان کی ساخت و پرداخت کا ذمہ وار متصور ہو گا

(میزان الاعتدال طبع خانجی مصر ۱۳۲۵ھ جلد ۱/۱۶۵)

اور اسی "بہز" کے بارے میں ابنِ حجر کی تصریح یہ ہے کہ ــــ اس کا تعلق راویوں کے چھٹے طبقے سے تھا اور یہ وہ طبقہ تھا جس نے کسی بھی صحابی سے نہ تو ملاقات کی اور نہ ہی دیکھ پایا تھا ــــ (تقریب التہذیب طبع مصر جلد ۱/ ۶)

اس کے معنے یہ ہوئے کہ بہز نے اپنے دادا، معاویہ بن حیدہ قشیری کو دیکھا تک نہیں تھا لہٰذا اس کی تمام ایسی روایات جن میں زیرِ بحث حدیث بھی ہے نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام حاکم نے اپنے استقرار کے نتیجہ میں اس کی روایات کو "غیر متابع" کہہ کر پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیا ہے کیونکہ ایسی روایات منقطع اور مرسل ہوں گی اور جب تک ان کا کٹا پھٹا سلسلہ جڑ نہیں سکتا اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

امام طبرانی ہی نے اس سلسلے کی دوسری سند کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

ابوبکر الہذلی (البصریؒ) عن الحسن (البصریؒ) عن شہر بن حوشب عن عائشۃ مرفوعا نحوہ سواء (۱)

(طبرانی "معجم الوسط" بحوالہ نصب الرایہ جلد ۳/ ۲۵۶)

جرح ابوبکر ہذلی ناقابلِ اعتبار راوی تھے۔ غندر، ابنِ معین اور نسائی اُسے غیر ثقہ شمار کرتے تھے۔ امام احمد نے صاف لفظوں میں اُسے ضعیف کہا ہے۔ یزید بن زریع (۱۹۸ھ) جان کر اس کی احادیث سے گریز کرتے تھے۔ ابوحاتم (۲۹۰ھ) نے انتہا درجہ کمزور کہہ کر اسے پایۂ اعتبار سے گرا دیا تھا۔ اسی طرح نسائی اور بخاری اس کی ثقاہت اور حافظہ کو مشتبہ اور ناقابلِ بھروسہ ٹھہراتے تھے ــــ یہ ہذلی روایت کرتے تھے اپنے استاد حسن بصری سے جو انتہا درجہ کے

---

(۱) یہ تمام راوی مرکزِ فتنہ بصرے کے تھے حجاز کے نہیں تھے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حجاز والے قتلِ مرتد کی سیاسی پالیسی سے قطعی ناآشنا تھے۔

مدلس بھی تھے اور مرسل بھی اور یہ عادت مستزاد کہ وہ ایسے لوگوں سے بھی روایت کر لیتا تھا جن سے نہ شناسائی ہوتی تھی نہ تعارف اور ہمکلامی۔ اور یہ روایت کرتے ہیں حرف "عن" کے ساتھ اپنے استاد شہر بن حوشب (۱۱۸ھ م) سے جو چور، بد دیانت اور دروغ گو تھے، یہ شام سے عراق آئے تھے اور یہاں بیت المال کے خزانچی بنا دیئے گئے تھے مگر چوری کی ایسی لت پڑ گئی کہ الامان۔ مشہور شاعر "قطامی" (۱۰۲ھ م) الکلبی کہتے ہیں۔

لقد باع شهرٌ دينه بخريطة

فمن يأمن القراء بعدك يا شهر؟

شہر نے روپوں کی ایک ہمیانی کی خاطر دین (اور ضمیر) کو بیچ دیا۔ اے شہر تم زاہد و عابد ہو کر اگر چور اور خائن ہو تو تم ہی بتلاؤ دوسرا کون ہے جو قابلِ اعتماد ہو سکتا ہو؟

(تہذیب التہذیب طبع دکن جلد۴/ ۳۶۹)

یعنی شہر اگر اتنا بڑا عالم ہو کر بھی "مہا چور" بن سکتا ہے تو دوسرا کون ہے جو خیانت اور بد دیانتی سے پرہیز بھی کرتا ہو اور احادیث نبوی[۲] میں دیانت داری سے کام بھی لیتا ہو۔؟

یہ شہر نہ صرف چور اور ڈکیٹ تھے دروغ گو بھی تھے۔ ذہبی نے اس کی خود ایجاد احادیث کے نمونے دیے کہ ایک گونہ اس کی بد فطرتی کا اظہار کیا ہے۔ جس سے شہر کی حالتِ زار کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے لہذا شہر جیسے راوی کی پشت پناہی "من بدل دینہ" کو حدیث نہیں بنا سکتی۔ (۱)

(۱) شہر بن حوشب پر کی گئی جرحوں کی تفاصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ میزان الاعتدال جلد ۱/ ۴۵۱ راوی ۳۷۰۰)

طبرانی کی دونوں سندیں ناکارہ ہیں

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ سیّدنا علی مدینہ طیبہ میں خاطر خواہ۔ پذیرائی نہ پاکر عراق چلے گئے تھے اور مدینے کی مرکزیت ختم کر کے بصرہ ہی کو دار الحکومت میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس کے باعث ہوا یہ کہ "سیاست" حجاز سے جلاوطن ہو کر شام اور عراق میں پناہ طلب ہوئی۔ اور وہیں یہ تمام دھڑے اپنی اپنی حمایت میں حدیث سازی میں لگ گئے۔ اِن دنوں عراق میں، کوفہ و بصرہ اور شام میں حمص، صیدا اور حلب نے سیاسی احادیث تراشنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ اب صرف پارٹی حمایت کے جذبے پر حدیث سازی کا انحصار نہیں رہا۔ پیشہ وررادیوں نے کم اجرت پر ہر قسم کا مواد فراہم کر کے اصلی پارٹی بازوں کا بوجھ ہلکا بھی کر دیا تھا۔ اِن لوگوں نے ایسی احادیث کو جنم دیا جنہیں اہلِ حجاز اور حرمین شریفین والے جانتے تک نہیں تھے حالانکہ احادیث کا جو تعلق حرمین شریفین سے ہونا چاہیئے اس کا مظاہرہ نہیں کیا گیا اور خود رَو گھاس کی طرح اگنے والی سیاسی اور مذہبی احادیث کے خلاف امام مالک اور امام شافعی کو بجا طور پر نوٹس لینا پڑا کہ

"جس روایت کی بنیاد حجاز میں نہیں اس کا مغز جاتا رہا"

(تدریب الراوی، سیوطی طبع مصر ص۲۳)

یعنی جس طرح "بیج" سے روغن نکال دینے پر باقی "پھوک" رہ جاتا ہے اس طرح جس روایت کو حرمین شریفین والے نہ جانتے ہوں وہ "پھوک" کی مانند ہیں لہذا ان سے نہ رجوع کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی معرضِ استدلال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

تابعیوں کے بڑے امام۔ طاؤس بن کیسان (سنہ ۱۰۶ م) فرماتے ہیں۔

اذا حدثك العراقي مأة حديث فاطرح منها تسعة و
تسعين وكن من الباقي في الشك۔

"کوئی عراقی جب تمہیں سو حدیثیں سنا دے تو تم ۹۹ کو تو پھینک ڈالو
اور باقی میں بھی شک سے کام لو"

(ابوداؤد طبع مجتبائی دہلی جلد ۲/ ۳۵)

اس تجزیہ کی رو سے جنگ صفین کے موقع پر گھڑی گئی اِن روایات کی نہ کوئی
اصلیت ہے نہ اساس۔ بلکہ جنگِ جمل کی مناسبت سے بصرے والوں نے جس
طرح عائشہ رض صدیقہ کے موقف کو کمزور کر دکھلانے کی سعی لاحاصل کی تھی اسی طرح
صفین میں ان ہی لوگوں نے علی علیہ السلام کے موقف کو نشانہ بنا کر۔ اپنی "دُون
فطرتی" کا نیز مظاہرہ کر ڈالا تھا۔

قتلِ مُرتد نبی اکرم کے ہاتھوں؟

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ۔ اُمّ مروان۔
کے مرتد ہونے پر۔ نبی اکرم صلے اللہ
علیہ وسلم نے اسے قتل کر دیا تھا۔ جیسا کہ دارقطنی (طبع اول دہلی ص ۳۳۸) کی روایات
سے ظاہر ہے۔

لیکن وہ نہیں جانتے کہ اس واقعہ کی تمام اسانید مجروح اور کذاب راویوں
پر مشتمل ہیں ــــ ایک سند میں عبداللہ بن اُذینہ واقع ہے جس کے بارے میں
خود دارقطنی (ص ۹۹۵) ہی نے وضاحت کر دی ہے "متروک" ہے اسے کسی نے
بھی منہ نہیں لگایا۔ اسی طرح دوسری سند میں محمد بن عبدالملک انصاری اور
معمر بن بکار واقع ہیں۔ اول الذکر کے بارے میں امام احمد جیسے نقادِ فن کا خیال
ہے وہ کذاب اور وضاع الحدیث تھا۔ اور معمر کے بارے میں عقیلی نے کہا ہے
کہ عارضۂ وہم میں مبتلا تھا۔ لہٰذا اتنی واضح جرحوں کے بعد اُمّ مروان کے

واقعہ سے نہ رجوع کیا جا سکتا ہے اور نہ استدلال ۔۔۔ یہ علاوہ اس کے فقہائے احناف نے امِ مروان کے قتل کو قصاص کا قتل ٹھہرایا ہے ۔ علامہ سرخسی حنفی (۴۹۰ھ) نے "المبسوط" میں اسی ہی طرف اشارہ کیا ہے ۔ خاص کر احناف کے نزدیک امِ مروان کے قتل کا واقعہ ۔ قصاص کا ہونے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے تعلق رکھتا ہے ۔ جب کہ آپؐ کا "قول" اس کے خلاف مفہوم دیتا ہے[1] اور قاعدہ یہ ہے کہ ایک حدیث جب "قولی" ہو اور دوسری "فعلی" یعنی دونوں میں تعارض ہو تو وہاں ترجیح "قولی" کو ہو گی ۔ بنابریں احناف کہتے ہیں کہ

> ایک بار نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ایسی عورت پر گذر ہوا جو قتل کر دی گئی تھی ۔ آپؐ نے فرمایا صنفِ نازک لڑائی سے تعلق نہیں رکھتی اسے کیوں مارا گیا ہے ؟
>
> (نصب الرایہ طبع قاہرہ جلد ۳)

اس طرح وہ کہتے ہیں ۔ آپؐ نے اپنے قول سے عورت کے قتل کو ناپسندیدہ فرما کر "قتل" نہ کرنے کی "علت" بتلا دی کہ عورت "برسرِ پیکار" ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ۔ اِس طرح آپؐ کا یہ قول آپؐ کے فعل کے خلاف ہے ۔ جو قاعدے کی رو سے وہی قابلِ عمل اور لائقِ ترجیح ہے ۔

احناف کا یہ نظریہ کہ جو "برسرِ پیکار" نہیں اسے قتل نہ کرنا چاہیئے کچھ وسعت چاہتا ہے اور زمانہ حال کے احناف اگر اس "علت" کو کھلے دل سے قبول فرما دیں تو فقہاء محدثین کی بیان کردہ تمام احادیث کا بھرم بھی رہ سکتا ہے اور قتلِ مرتد کے بارے میں ایک معقول توجیہ اور "علت" کے تقاضے بھی پورے ہو سکتے ہیں ۔

(۱) آپؐ نے ایک مقتول عورت کو دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا ۔

کیونکہ حدیث کی طرح قرآن پاک بھی "بر سرِ پیکار" نہ ہونے والے سے تعرض نہیں فرماتا۔ (ملاحظہ ہو ن۔ ر "۹۰)

آثارِ صحابہ کا رول

کچھ لوگوں نے احادیث و روایات کے علاوہ صحابہ کرام کے بعض غیر مستند "آثار" کو بھی "قتل مرتد" کے جواز کے لئے پیش کیا ہے بلکہ مولانا مودودی نے تو اِس گوشے کو زیادہ نمایاں اور زیادہ زور دار طریقے سے ابھارنے کی کوشش کی ہے لیکن قانون کا مزاج سمجھنے والے بخوبی سمجھتے ہیں کہ اِن "آثار" کی شرع کی تکنیک میں نظائر و شواہد سے زیادہ کچھ بھی حیثیت نہیں ہے۔ اکثر کا جواب تو اُن کے بین السطور ہی میں موجود ہوتا ہے اور زیادہ تر "آثار" کی تو اسناد ہی مجروح منقطع، اور مرسل ہوتی ہیں۔ مودودی نے حسبِ عادت، جاگیرداری کے ثبوت میں بھی آثارِ صحابہ ہی کی آڑ لے رکھی تھی لیکن جب اِن کا فنی تجزیہ کیا گیا تو ایک بھی ایسا "اثر" نہیں ملا جو "قواعدِ صحیحہ" کی رو سے حقیقت کی غمازی کر سکتا (۱)۔ اسی طرح "قتلِ مرتد" کے "آثار" بھی زیادہ تر مجروح، وضاحتِ مطلوبہ سے قاصر اور ہمہ قسم روشنی سے عاری ہیں۔

اِن "آثری" فیصلوں میں سب سے زیادہ اہمیت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ (سنہ ۶۴۰ء) کے اُس فیصلے کو دی جا رہی ہے جو یمن پہنچ کر آپ نے ایک یہودی مرتد کو قتل کر دینے کے بارے میں صادر فرمایا تھا۔ امام بخاری اپنی سند کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

(۱) مودودی صاحب نے "مسئلہ ملکیتِ زمین" کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جس کے جواب میں راقم الحروف نے "زمینداری، جاگیرداری اور اسلام" کے نام سے ایک تفصیلی تبصرہ لکھا تھا جو جنوری سنہ ۱۹۶۸ء میں لاہور میں طبع ہو کر ضرب کاری رسید کر گیا تھا۔

ابو موسیٰ اشعری رضہ (۶۵۲م) کہتے ہیں کہ۔ ایک یہودی مسلمان ہو کر بعد میں پھر "یہودیت" کی طرف لوٹ گیا تھا (اب جس وقت معاذ یمن کے گورنر بن کر تشریف لائے تو) میں نے معاذ سے کہا کہ تشریف رکھیے معاذ نے کہا کہ جی نہیں۔ میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک اس مرتد کو قتل نہ کر دوں۔ یہ کہہ کر معاذ نے اسے قتل کر دیا (اور قتل کے جواز میں کہا کہ) اللہ اور رسولؐ کا یہی فیصلہ ہے

(مختصر بحوالہ فتح الباری جلد ۱۲/ ۲۶۸ حدیث ۶۹۲۳)

جرح | اس واقعہ کو امام بخاری نے متعدد بار ذکر فرمایا ہے اس کے باوصف احادیثِ نبویؐ کے سب سے بڑے شارح علامہ ابن حجر (۱۴۴۹م) کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ۔ ان میں ارسال واقع ہوا ہے۔

(فتح الباری طبع سلفیہ مصر جلد ۸/ ۶۳/ ۱۱)

اور مرسل روایات کے بارے میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے۔ شافعی، ابن حنبل اور محدثینِ کرام ایسی روایات کو حجت اور قابلِ اتباع نہیں سمجھتے تھے۔ مالکی اور حنفی قبول کرتے تھے۔

(الکفایۃ طبع دکن ص۳۸۴ و ص۳۸۵ و معرفۃ علوم الحدیث للحاکم طبع مصر ص۲۶ تا ۲۷)

اور اختلافی مسائل کے بارے میں یہ طے شدہ ہے کہ۔ امتِ اسلام کا کوئی بھی فرد تسلیم و رضا پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لہٰذا حضرت معاذ کا فیصلہ مرسل ذریعوں سے روایت ہو کر، توانائی، پختگی اور رسوخ کے جوہر سے عاری ہو چکا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر کو واقعۂ یمن کی اسناد کے ایک راوی سعید بن ابی بردہ زیادہ کھٹکے تھے جو اپنے آپ کو "قتلِ مرتد" کے واقعہ کا عینی شاہد بتلا کر معاذ کے فیصلے کا راوی ظاہر کرتے تھے کیونکہ سعید تابعی ہو کر وضاحت کرتے

ہیں کہ۔ ابو موسیٰ اور معاذ بن جبل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ وہاں پہنچ کر معاذ نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ ایک مرتد کا قتل کرنا تھا۔ وغیرہ

اب سوال یہ ہے کہ سعید کو کیسے معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو صحابہ کو یمن بھیجا تھا؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ سعید اس ذریعہ کی نشاندہی کرتا جس نے اس سے واقعہ بیان کیا تھا ورنہ تو سعید تابعی ہو کر واقعہ کے عینی گواہ نہیں بن سکتے۔ یا یہ کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے واقعہ کی اشاعت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اصولِ شہادت کی رو سے اس کی گواہی مسترد ہے۔

اسی فنی خرابی کے باعث ہی ابن حجر کو نرم پالیسی اختیار کرنا پڑی اور وہ اس واقعہ کے ارسال کا اعتراف کر بیٹھے تاہم ابن حجر اپنی کمزوری کو اس انداز سے واضح بھی نہ کر سکتے تھے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی مشکوک ہو کر رہ جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ مختصر اور مفصل کئی مقامات پر دہرایا گیا ہے ——— جی ضرور دہرایا گیا ہے لیکن اس سے آپ یہ کیوں باور کرانے لگے کہ لہٰذا اس کی ضرور کوئی اصلیت ہے؟ کیا ایک غلط بات کو بار بار دہرانے سے حقیقت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ پھر طرفہ تماشہ یہ کہ اس روایت کی بابت ابن حجر خود ہی لکھتے ہیں کہ۔

والسند کلہ بصریون

"سند کے تمام راوی بصرے کے ہیں" (فتح الباری جلد ۱۲/۲۷۳/۱۹)

اور یہ اندازِ وضاحت ظاہر کرتا ہے کہ حدیث نبیؐ کے گھر کی نہیں ہے۔ بصرہ جہاں سیاست کا کاروبار زوروں پر تھا وہاں جنم دی گئی ہے

ابن حجر ہی نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ جس یہودی کو جرم ارتداد میں قتل کر دیا گیا تھا آج تک اس کے نام کا پتہ بھی نہیں چل سکا لکھتے ہیں۔ ولم اقف

على اسم الرجل المذكور

"دل خراش واقعہ کے جس کردار کو لقمۂ اجل بنایا گیا تھا آج تک اس کے نام کی وضاحت بھی نہیں کی جا سکی"

(فتح الباری جلد ۱۲/۲۷۴/۱۹)

غور - فرمایئے اتنا بڑا حادثہ وقوع میں آچکا ہے مگر حادثہ کا ہیرو معلوم نہیں ہے۔؟ کیا یہ کسی نے ہوائی تو نہیں اڑائی تھی جسے بعد میں حقیقت ہی سمجھ لیا گیا؟

ہمارے نزدیک تو اس واقعہ کی نفی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہودی کی گردن مار دینے کے وقت معاذ نے اپنے عمل کے لئے یہ کہہ کر جواز پیدا کیا تھا کہ ——

قضاء اللہ —— اسے اللہ کے حکم کے مطابق قتل کیا ہے (بخاری)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ نے کس آیت میں فرمایا تھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے؟ - اللہ نے تو الٹا یہ فرمایا ہے کہ - "پُرامن" **مرتد** کو کسی بھی اذیت سے دوچار کرنے کی نہ اجازت ہے نہ گنجائش (ملاحظہ ہوں) آیات عمران (۹۰) نساء (۱۷۳) عمران (۷۲) بقرہ (۱۵) نساء (۹۰) بقرہ (۲۵۶) مائدہ (۵۳) زمر (۴۱) بقرہ (۲۱۷) اور یونس (۹۹)

اس طرح نہ صرف قرآن پاک کے حوالہ سے غلط بات کہی گئی ہے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی نظریۂ "قتل مرتد" کی تائید سے قاصر ہے اور یہ بصرے کے راویوں کی بڑی جسارت ہے کہ معاذ کے فعل کے لئے معاذ ہی کے منہ سے کہوا بیٹھے کہ یہ میرا نہیں اللہ کا فیصلہ ہے -؟ بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ - کہ سب سے کمزور وہی روایت ہے جس میں قسم کھا کر بات کی گئی ہو - یا کسی طرح کی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لئے اللہ کو شریکِ محفل گردانا گیا ہو - واللہ اعلم

معاذ کی ایک اور روایت

راویانِ احادیث میں مرذہنی استعداد

کے افراد موجود تھے ان میں سے بعض اظہارِ مفہوم کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے تھے جو بظاہر ناقابل اعتراض ہوتے تھے لیکن اہلِ فن کی دقیق رس نظر انہیں تاڑلیتی اور مفہوم کے سقم کے حوالے سے مسترد کر دیتی تھی - ایسے لوگ اپنے طور پر سادہ لوحی کا مظاہرہ کرتے ہوئے - جوں کا توں پہنچانے کے مدعی ہوتے تھے - اس کے برعکس ہشیار قسم کے راوی ایسے الفاظ کا سہارا لیتے جو ان کے خیال میں واضح مفہوم رکھتے تھے مثلاً ابن حجر معاذ بن جبل سے راوی ہیں کہ - ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما ارسلہ الی الیمن قال لہ ایما رجل ارتد عن الاسلام فادعہ فان عاد و الا فاضرب عنقہ وایما امرأۃ ارتدت عن الاسلام فادعھا فان عادت - والا فاضرب عنقھا وسندہ حسن

" معاذ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن بھیجا تو یہ بات ذہن نشین کرادی کہ - کوئی بھی شخص جب اسلام سے منحرف ہو جائے تو اسے ایک بار اسلام کی طرف بلالو - اگر وہ بلاوا قبول کرلے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی گردن ماردو - اس طرح کوئی بھی عورت جب اسلام سے برگشتہ ہو تو اسے دوبارہ اسلام کی پیش کش کرو - اگر تو وہ قبول کرلے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کی بھی گردن اڑادو" (۱)

(فتح الباری جلد ۱۲/۲۷۲/۱۳ تا ۱۵)

اس روایت کے الفاظ کی سیٹنگ اور مضمون بندی کے لئے زبان کے ارتقار کو بطورِ خاص کام میں لایا گیا ہے کیونکہ اظہارِ مفہوم کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ زمانۂ بعد کا ہے -

(۱) اس حدیث کو حنفی مذہب والے نہیں مانتے کہ اُن کے نزدیک مرتد عورت کے لئے سزائے موت نہیں ہے

اس حدیث کی سند کے لئے ابن حجر نے "حَسَنٌ" کا لفظ اختیار کیا ہے
جو پوری طرح صحتِ روایت کا غماز نہیں ہے۔ بس "گوارا" سند کہہ کر کام چلا یا
گیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ ابنِ حجر نے اپنی عدالت سے "حسن" کی ڈگری دے
کر بھی سند کا اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ البتہ امام زیلعی حنفی (۷۶۲ھ م) نے سند
کی نشاندہی کر کے ابن حجر کی فروگذاشت کی تلافی کر دی ہے۔

زیلعی لکھتے ہیں کہ۔ حدثنا الحسین بن ابراھیم التستری حدثنا
ھرمز بن معلی حدثنا محمد بن مسلمۃ عن الفزاری۔
عن مکحول عن ابی طلحۃ الیعمری عن ابی ثعلبۃ الخشنی
عن معاذ بن جبل

(طبرانی۔ بحوالہ۔ نصب الرایہ طبع قاہرہ جلد ۳/ ۴۵۶)

جرح اس سند کے ابتدائی راوی صحاح ستہ کے رُواۃ سے تعلق نہیں
رکھتے۔ خاص کر محمد بن مسلمہ اس پائے کے نہیں تھے کہ اس پر کسی
اعتماد سے کام لیا جائے۔ ابو القاسم لالکائی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ ابن عدی
اور دارقطنی اِسے غیر معروف حدیثیں بیان کرنے والا بتلاتے تھے اور ابن جوزی
نے اس پر وضع حدیث کی فردِ جرم عائد کر کے زیر بحث حدیث کو ایک طرح سے
خود ساختہ اور جعلی قرار دیا ہے۔ ہبۃ اللہ طبری و ابو محمد الخلال۔ ابنِ مسلمہ کو انتہا درجہ
ضعیف کہتے تھے۔

یہ محمد بن مسلمہ روایت کرتے ہیں فزاری سے جس کا پورا نام محمد بن عبد اللہ
"العرزمی" ہے جو کوفے کا باسی تھا امام احمد نے جس کسی کو دیکھا عرزمی سے
بیزار پایا۔ ابن معین اس کی احادیث کو لکھنے کی حد تک بھی گوارا نہ کرتے تھے۔
الفلاس۔ کہتے تھے کہ لوگوں نے اسے اُن راویوں میں شمار کر رکھا تھا جنہیں منہ لگانا

بھی روانہ تھا۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ ایسا راوی ہے جس کے ضعف پہ نقادانِ فن اتفاق رائے رکھتے تھے۔ نسائی نے اس کی ثقاہت کو نشانہ بنایا اور عبداللہ بن مبارک و یحییٰ قطان نے متروک راویوں میں شمار کیا ہے۔

اس طرح صرف عزرمی ہی کی وجہ سے اگر دیکھا جائے تو بھی یہ روایت "حسن" نہیں ہو سکتی مگر ابنِ حجر نے اسے بلاوجہ "حسن" کے درجہ پہ رکھ کر دیانت کو مجروح کیا ہے۔

یہ عزرمی روایت کرتے ہیں مشہور سندھی عالم۔ امام مکحول (ت ۱۳۰ھ م) سے جو بہ ایں جلالتِ شان "مدلس" تھے(۱) بلکہ ابن حجر کے بقول۔ یہ حدیثوں کو ارسال کے ذریعہ بیان کرنے کے نیز مریض تھے یعنی تابعی کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے تھے(۲) اور قاعدہ یہ ہے کہ مدلس جب حرفِ "عن" کو ذریعہ اظہار بنائے تو اس کی روایت قطعی مسترد ہو گی جیسے روایت ہذا کی سند میں ہے۔

عن مکحول "عن" ابی طلحة۔

مکحول کے بعد ابوطلحہ کا نام آتا ہے جس کا پورا نام شداد بن سعید۔ رُواسی بصری ہے۔ یہ راویوں کے آٹھویں طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کی کسی طویل العمر صحابی سے بھی ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ابن حجر زیرِ بحث کو "حسن" بنانے کے لئے جتنا بھی جولانئ طبع سے کام لیں "قواعدِ صحیحہ" کی رو سے غلط اور بد دیانتی کا پلندہ ہے۔

فاروقِ اعظمؓ قتلِ مرتد قرآن میں نہیں پاتے تھے

حضرت معاذ کی روایت میں دکھلایا گیا ہے کہ آپ نے ایک نامعلوم مرتد کو تہِ تیغ کرنے کے بعد۔ قرآن پاک کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ

(۱) طبقات المدلسین طبع مصر ۱۳۲۲ھ ص ۱۶ - (۲) تقریب التہذیب طبع قاہرہ جلد ۲/ ۲۷۳ راوی ۱۳۵۴

ہے کہ اگر قرآن پاک میں کہیں بھی "قتلِ مرتد" کا اشارہ ملتا تو اتنی بے پایاں روایات بنانے کی ضرورت لاحق نہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ نہ صرف معاذ کو۔ دیگر قدآور صحابہ رسول کو بھی معلوم ہو سکتا کہ۔ قرآن کا منشار کیا ہے؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یمن میں بیٹھے معاذ کو تو یہ گیان حاصل ہو جاتا ہے مگر۔ مدینہ میں رسول کے زیرِ سایہ بیٹھنے والے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (۶۴۴ء) پر یہ راز منکشف نہیں ہوتا۔ کیا ابنِ خطاب کی روحانی توانائی اس قدر ماند پڑ گئی تھی کہ لوگوں کو تو قرآن ہی میں "قتلِ مرتد" کا سراغ ملتا ہے مگر آپ اس بارے میں قطعی بے خبر رہ جاتے ہیں؟ - امام ابنِ حزم اندلسی (۱۰۶۳ء م) اپنی سند کے ساتھ ذیل کی روایت بیان فرماتے ہیں کہ

"ابو موسیٰ اشعری نے جحینہ (HUJAINA) کو جب تہِ تیغ کر ڈالا تو مالک بن انس (۷۹۵ء م) فاروقِ اعظم کی خدمت میں چلے آئے۔ ابنِ خطاب نے انس سے دریافت فرمایا کہ۔ جحینہ اور اس کے ساتھیوں کا کیا بنا؟ (انس کہتے ہیں میں نے ابنِ خطاب کے استفسار کو تین مرتبہ ٹالنے کی کوشش کی مگر جب آپ کا اصرار بڑھ گیا تو) میں نے کہا ——— "بھلا قتل کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟ ——— اس پر آپ نے فرمایا معاملہ اگر میرے پیش ہوتا تو میں اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا۔ مان جاتے تو ٹھیک ورنہ تو جیل بھجوا دیتا (قتل نہ کرتا)"

(المحلی۔ بحوالہ "الحریۃ الدینیۃ فی الاسلام"[1] طبع مصر ص ۱۱۳ / ۶ تا ۱۴)

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ "قتلِ مرتد" کا حکم ۔ فاروقِ اعظم کے عہد تک قرآن پاک میں نہیں تھا ورنہ تو یہ ناممکن تھا کہ اتنے اہم فوجداری کیس کی تعزیر کے لئے قرآن میں حکم ہو اور فاروقِ اعظم ابو موسیٰ کے فیصلے کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھتے ہوئے

(۱) مصنفہ۔ عبد المتعال الصعیدی۔

یہ فرمادیں کہ - میں ہوتا تو - قتل نہ کرتا - اپنی صوابدید کے مطابق جیل بھجوا دیتا - کہ جیل سے بھی اصلاحِ احوال کا کام لیا جا سکتا ہے :

جیل بھجوانا بھی اگرچہ جبر و استکراہ کی رو سے ممنوع ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فاروقِ اعظم کے سامنے صورتِ حال اس طرح کی ہو گی کہ آپ نے اپنی ذاتی صوابدید کے مطابق مرتدوں کو لوگوں کی ممکنہ زیادتی سے محفوظ کرنے کے لئے - جیل کا عارضی نسخہ تجویز فرمایا ہو گا - یعنے انہیں زیرِ حفاظت رکھا ہو گا - جو نہ تو زیادتی ہے اور نہ ہی جبر و استکراہ کی رو سے ممنوع -

مرتدوں کو آگ میں جلانے کا واقعہ

امام بخاری اپنی سند کے ذریعہ فرماتے ہیں کہ

" حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جب " زنادقہ " پیش کیے گئے تو آپ نے ان کو آگ میں جلا دیا ـــــ لیکن اس واقعہ کی جب ابنِ عباس کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ - معاملہ اگر میرے پیش ہوتا تو میں جلانے کی بجائے - فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق انہیں قتل کرا دیتا "

(بحوالہ فتح الباری جلد ۱۲ / ۲۶۷ حدیث ۶۹۲۲)

جرح

اس حدیث کے ایک راوی عکرمہ پر ہم نے بھرپور جرح کے دوران واضح کیا تھا کہ اس میں دروغ گوئی کا بھاری عیب بھی تھا یہ تفصیل اپنے مقام پر آچکی ہے - یہاں واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ - امام بخاری عنوان تو قائم کرتے ہیں " مرتدوں " کے احکام کے بارے میں اور روایت لاتے ہیں زنادقہ کو آگ میں جلا ڈالنے کی ؟ آخر عنوان اور متن میں کیا مطابقت ہے جو اس کی اساس پر انسانوں کو " اگنی دیوی " کی بھینٹ چڑھانے کی ہندوانہ رسم ادا کی جا رہی ہے - کیا

امام بخاری اپنے گہرے اجتہادات کی روشنی، لغت اور ادبیات کے حوالے سے بتلا سکتے ہیں کہ۔ زندیق۔ اور" مرتد" ایک ہی معنیٰ اور مفہوم رکھتے ہیں؟ کیا اشعارِ جاہلیت اور ادبیات عرب کے کسی شعر یا" شہ پارے" کے حوالہ سے بات ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہاں امام بخاری سے اجتہادی تسامح ہو گیا ہے اور اس پر" اڑ" جانا سراسر زیادتی ہے۔ اور یہ قطع نظر اس کے کہ۔ حضرت علیؓ نے جن لوگوں کو آگ کا دیا عبور کرنے کا حکم دیا تھا وہ کون لوگ تھے؟ کیونکہ ابن حجر نے جو تفاصیل فراہم کی ہیں اُن کی رو سے یہ لوگ

"زنادقہ تھے ــــــ کسی نامعلوم قوم کے افراد تھے (قومًا) ــــــ مرتد تھے ــــــ پوشیدہ طور پر بت پرستی کرتے تھے ــــــ اور ابوالمظفر اسفرائنی کے بقول یہ لوگ علی المرتضیٰ کے عقیدت مند رافضی تھے جو آپ کی اُلوہیت کے قائل تھے"

(فتح الباری جلد ۱۲/ ۲۷۰/ ۴ تا ۹)

یہ تفاصیل واضح کرتی ہیں کہ ان لوگوں کے ذہن میں" زنادقہ" کا متعین مفہوم تھا ہی نہیں بس ایک خواب تھا جو کثرتِ تعبیر کے باعث پریشان ہو کر رہا۔ اور ہمارے اکابر ہیں کہ ان ہی افکارِ پریشان کو دین کی اساس اور بنیاد میں شامل کر کے ہم سے طالب ہیں کہ اِن کو" رب" تسلیم کریں یا جو کچھ یہ فرما دیں اسے حکمِ رب کی حیثیت سے مان لیں؟ جب کہ صحابہ کے یہ آثار واضح کرتے ہیں کہ۔ مرتدین کے بارے میں یہ حضرات یک رائے اور متفق الخیال نہیں تھے یہ کہتے تھے کہ ــــــ مرتد کو قتل کر دیا جائے ــــــ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ۔ مرتد کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے ــــــ نیز اِن کو جیل میں محبوس رکھنے کی پالیسی پر بھی عمل پیرا تھے یعنے ان میں سے کوئی بھی طے شدہ فیصلہ نہیں تھا ہر ایک نے اپنی ذمہ داری پر جو چاہا فیصلہ صادر

فرما دیا۔ اس میں معروضی حالات کا دخل بھی تھا اور مذہبی روایات کا دباؤ بھی۔ لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے دین کی تکمیل اور نبوتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پر اگر ایمان ہے تو ہم کسی غیر نبی کے فیصلے کو اس انداز سے تسلیم کرنے کے پابند نہیں ہو سکتے کہ قرآنِ پاک کے واضح اور صریح فیصلوں کو پس منظر میں لے جائیں۔

عالمِ عرب حالتِ جنگ میں تھا!

گذشتہ واقعات و روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ جن مرتدوں کو ناگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کی بنیادی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ایک تو ان دنوں اسلامی احکام کی بہت سی جزئیات کا لوگوں کو بخوبی علم نہیں تھا یا یہ کہ۔ دور دراز علاقوں تک جزئیات کا ہنوز مکمل تعارف نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا مدعیانِ نبوت جب اپنے مشن کے مطابق کوئی بات کرتے تو ناواقف لوگ اسے بھی اسلام ہی کا مسئلہ سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ کسی نبی نے اگر یہ کہا کہ مالدار لوگوں پر زکوٰۃ نہیں ہے تو خوش حال لوگ اسے ہی حسبِ حال سمجھ کر خیال کرتے تھے کہ اللہ سبحانہ نے سابقہ حکم منسوخ کر دیا ہے۔ اسی طرح کسی نے حق المہر کے مسئلہ کو اس طرح نمٹانے کی اگر کوشش کی کہ اس کی ضرورت نہیں ہے تو لوگ اسے بھی ضرورت کی چیز خیال کر کے قبول کرتے تھے۔ الحاصل شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) کے دوش بدوش مرتد عناصر نے اپنی شریعتوں کو بھی شریکِ سفر بنا رکھا تھا۔ اسی طرح ۶۳۱ء سے لے کر ۶۳۳ء تک یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے آخری سال سے لے کر آپؐ کی وفات کے دوسرے سال تک اصلی اور جعلی شریعت کی آویزش رہی۔ اس طرح گویا عالمِ عرب حالتِ جنگ میں تھا۔ اپنے تحفظ اور بقاء کے لئے اگر ہاتھ پاؤں نہ مارتا تو۔ نہ شریعتِ محمدیہ محفوظ رہ سکتی تھی اور نہ اسلامی میجارٹی کی بقاء ممکن۔ لہٰذا اس کے سدِّباب میں مختلف اوقات میں

مختلف ذرائع استعمال کئے گئے یہ بالکل معروضی حالات تھے نارمل اور پُرسکون نہیں تھے اور معروضی حالات کے "احکام" عام قاعدے قانون سے ہٹ کر ترتیب دیئے جاتے ہیں وہ مستقل نہ ہو کر بھی عارضی وقفے کے دوران مستقل ہی شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان دنوں۔ نومسلم عرب۔ مرتد ہوتے ہی سرکشی اور بغاوت شروع کر دیتے تھے بلکہ تاریخی واقعات بتلاتے ہیں کہ ایسا ہوا ہے۔ اس طرح اِن لوگوں کے ارتداد کو "دینی ارتداد" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دینی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ لیکن اس اعتراف کے باوصف اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ "پرامن ارتداد" پر نہ پابندی تھی اور نہ حفاظتی پہرے۔

مُرتدوں کو ندامت کا چانس زندگی بھر ملنا چاہیئے

یہ بات کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اشارۂ الٰہی سے منافقین کو بخوبی جانتے تھے کہ وہ ایسے مرتد ہیں جو صبح کو مسلم تو شام کو کافر بن جانے والے ہیں اور کہ اِن کا "ارتداد" حقیقی ارتداد بھی تھا اس کے باوصف آپؐ نے بہ این وسائل ریاست نہ تو انہیں موت کے گھاٹ اتارا۔ نہ آگ میں جلوایا اور نہ ہی جیل بے جا میں رکھا (جیسا کہ عمران (۷۲) اور بقرہ (۱۶) کی روشنی میں واضح ہو چکا)

تو کیا یہ ایک توانا دلیل نہیں کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پُرامن مرتد کو چھیڑ کر کوئی گھناؤنی تہمت اپنے سر لینے سے ہمیشہ گریز فرمایا؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ۔ امت اسلام کے بعض اہلِ فکر نے۔ مرتدوں کے لئے زندگی بھر نادم ہونے کا دروازہ کھلا رکھنے کا مشورہ دیا ہے کیونکہ اصولی طور پر ویسے بھی حالتِ زندگی میں کسی کو مرتد نہیں کہا جا سکتا۔ ابن حزم (۱۰۶۳ء م) نے "مراتب الاجماع" میں امام اعظم ابو حنیفہ کے استاد ابراہیم نخعی (۷۱۵ء م) سے نقل کیا ہے کہ ــــ اُن کے نزدیک ــــ مرتد کو ندامت کا تا زیست چانس دیا جائے گا (۱) بلکہ ابن حزم ہی

(۱) بحوالہ الحریۃ الدینیۃ فی الاسلام۔ عبدالمتعال صعیدی طبع قاہرہ ص۱۱۱

نے "المحلّٰی" میں واضح کیا ہے کہ نہ صرف "نخعی" بلکہ فقہا اور اصولیوں کے ایک بھاری گروہ (قوماً) - (یا) طائفۃ) نے بھی یہی رائے قائم کی ہے[1] بلکہ نخعی کی یہ رائے ابن حجر نے بھی نقل کی ہے اور اپنی عادت کے مطابق "تضاد" کے خانے میں رکھا ہے تاہم ایک مرحلہ پر یہ اعتراف کر کے اپنی عادت سے انحراف بھی کیا ہے۔ کہ - وعن النخعی یستتاب ابداکذا نقل عنه مطلقا

نخعی غیر مشروط طور پر کہتے تھے کہ مرتد کو رجوع کا چانس ہمیشہ ہمیشہ ملنا چاہیئے (ابداً مطلقاً)

(فتح الباری جلد ۱۲/۲۷۰/۲)

تو گویا نخعی کے نزدیک سزائے موت کی نفی ہو جاتی ہے اور ہر باشعور انسان کو نخعی کی آواز میں آواز ملانی چاہیئے۔

مرتد جو برسرِ پیکار نہ ہو

امام جمال الدین زیلعی حنفی (۷۶۲ھ م) نے ان روایات کو یکجا ذکر کیا ہے جو "مرتد عورت" کے قتل کی نفی کرتی ہیں وہ اپنی مبسوط کتاب نصب الرایہ میں تفصیل سے یہ تاثر دیتے جاتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کہ ـــــ عورت حرب و ضرب کے لیئے نہیں ہوتی لہٰذا اس کی زندگی سے تعرض نہ کرنا چاہیئے (۲) بات کیا ہوئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ "علت" خود ہی بیان فرما دی جس کی وجہ سے کوئی بھی "مـرتـد" محفوظ رہ سکتا ہے۔ یعنی کوئی بھی مرتد اگر "برسرِ پیکار" نہیں ہے تو نبوی فیصلے کے مطابق لڑائی و خون ریزی کی "علت" باقی نہیں رہتی۔ اس طرح آپؐ نے مرتد کے احکام کو ان احکام کے سلسلہ کا حکم بنا دیا ہے جو "علتوں" سے وابستہ ہوتے ہیں ادھر اصولیوں کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ ـــ

(۱) حوالہ مذکور (۲) نصب الرایہ طبع قاہرہ جلد ۳/۴۵۶

"یدور الحکم حیث تدور العلۃ"

"علت" سے وابستہ حکم "علت" ہی کے گرد گھومے گا (۱) اور جہاں "علت" نہ ہوگی حکم بھی نہ ہوگا یعنی قتلِ مرتد کا حکم "برسرِ پیکار" ہونے کی "علت" سے مربوط ہے لہذا جو مرتد۔ برسرِ پیکار نہیں وہ علتِ "پیکاریت" کے فقدان کے باعث محفوظ د مامون رہے گا۔ ن ۔ ر (۹۰) کا اشارہ بھی اسی طرف ہے! لیکن ہمارے مسلم معاشرے میں ایسے بھی انارکسٹ ہیں جو نہ تو قرآنِ پاک کی واضح ہدایات کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں اور نہ ہی "قتلِ مرتد" کی اُس "علت" کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہیں جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حتمی انداز میں پیش کر کے مرتدوں کو جان کی امان مرحمت فرمائی تھی؟

وہ کہتے ہیں کہ ہم "علت" وغیرہ کو نہیں جانتے ہمارے امام نے اگر عورت کو مستثنیٰ کر دیا ہے تو چلو صرف اِسے ہی زندہ رہنے دیں گے۔ لیکن کیسی زندگی؟ یہ نہ پوچھیے۔

مُرتد عورت، ہبہ، تملیک اور فروخت کیجائیگی

عورت کو اپنے امام کے حوالے سے زندگی بخشنے والے کہتے ہیں کہ

"مرتد عورت۔ اگر آزاد ہے تو علی کے نزدیک اِسے لونڈی بنا دیا جائے گا (وہ بغیر نکاح کے بھی کام برداری کر سکتی ہے۔ ہبہ اور فروخت کے کام بھی آ سکتی ہے)۔ اور عمر بن عبد العزیز فرماتے تھے اُسے کسی دوسرے ملک میں فروخت کر دیا جائے گا"

(فتح الباری جلد ۱۲/۲۶۸/۱۲ تا ۱۳)

(۱) حصول المامول

غور فرمایا آپ نے جسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) پناہ دیں یہ لوگ اپنے رسولؐ کی پناہ کو ختم کر کے اُسے ہی جان سے مار دیں یا جائداد منقولہ کی طرح فروخت کر کے پیسہ بٹور لیں۔؟ کیا رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم نے" برسرِ پیکار" نہ ہو سکنے کی علت سے عورت کو اگر جان کی امان بخشی تھی تو یہ اشارہ فرمایا تھا کہ اِسے قتل تو نہ کرو مگر لونڈی بنا کر جو چاہے کر لو۔؟ جب کہ اسلام کی جنگی تاریخ میں لونڈی بھی ان ہی کفار کی عورتوں کو بنایا جاتا رہا ہے جو برسرِ پیکار ہوتے تھے ــــــ کیا نبیؐ کی" پناہ" کو توڑنے والے درجۂ نبوت پر فائز تھے ؟ جواب اگر نفی میں ہے تو یہ کیسا اتباعِ نبیؐ ہے کہ مخالفت کر کے بھی طرۂ اتباع سجائے پھرتے ہیں ؟

قدیم مِلّی تقاضے

قتلِ مرتد کا عقیدہ ہمارے نقطۂ نظر سے اسلام کی تضحیک۔ نفسیاتِ وحی کی توہین اور انسانیت کی زبردست تذلیل پر مشتمل ہے۔ اس سے نفاق[1] پیدا ہوتا پروان چڑھتا اور صداقتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ تاہم اس بات کا اعتراف کر بھی لیا جائے کہ ــــــ "مرتدین" کو بلاتخصیص تہ تیغ کرنا اسلامی سوسائٹی میں رائج چلا آرہا ہے تو بھی نگاہِ حقیقت رس۔ میں یہ عمل خالص "سیاسی" نوعیت کا تھا اِسے نہ تو دائمی اور مستقل قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسلام کی پالیسی !! ہمارے اسلاف نے خود ہی اس کا اعتراف کیا ہوا ہے۔ علامہ " خطابی" (۹۹۸ م) فرماتے ہیں کہ

> "آج اور کل کے مرتدوں میں بڑا فرق ہے۔ کل کے مرتدوں کے لیے جو سنگین سزائیں تجویز کی گئی تھیں اُن کے اسباب حسب ذیل تھے۔

الف صدیٔ اول میں جب شریعت کے احکام تازہ بہ تازہ مل رہے تھے (یا مل چکے تھے) مرتد ہونے والوں سے اندیشہ تھا کہ تازہ صورت حال سے

---

(۱) غیر اصطلاحی نفاق

فائدہ اٹھا کر چپکے سے جسدِ شریعت میں اپنے نئے افکار کو شامل کر کے تبدیلی اور نسخ کا چکر چلانے میں کامیاب ہو جائیں لہٰذا انہیں قتل کر دینے کا فیصلہ کرنا پڑا کہ بحالاتِ موجودہ یہی واحد طریقہ - ان کی ممکنہ شرارتوں اور دسیسہ کاریوں سے بچنے کا ہو سکتا تھا -

ب مسلمان ابھی زیورِ تعلیم سے اتنے آراستہ نہیں تھے کہ پورے دین کی تفصیلات سے آگاہی رکھ سکتے - ایسے میں مرتدین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات سے بچنا ممکن تھا - لہٰذا اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ مرتدین کا استیصال کیا جاتا -

لیکن آج کے مرتدین کے قتل کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ (آج نئی "علتیں" ظہور پذیر ہو چکی ہیں اور) دینِ اسلام دنیا کے اطراف و اکناف میں اپنی اصلی حالت میں پہنچ چکا ہے اِسے خواص کی طرح عوام بھی جاننے لگے ہیں اب عالِم کی طرح جاہل بھی علم رکھتا ہے کہ دین میں نئی بات داخل کرنا ممکن نہیں رہا "

(خطابی بحوالہ نووی شرح صحیح مسلم طبع اصح المطابع دہلی ۱۳۲۰ھ و طبع کراچی ۱۹۵۶ء مسلم جلد ۱/۳۸/ اتا ۴)

علامہ خطابی کا یہ طویل اقتباس واضح کرتا ہے کہ جن دنوں مرتدوں کو کڑی آزمائش میں ڈالا گیا تھا وہ اس کا جواب تھا کہ انہوں نے بھی مسلمانوں کو کڑی صورتِ حال سے دوچار کر کے اِن کے دین و مذہب کو مشکوک بنانے کا سامان کر رکھا تھا بلکہ اپنی باغیانہ روش سے مسلمانوں کی جان و مال کو شدید خطرے میں بھی ڈال دیا تھا - تب وہ "علتیں" موجود تھیں اور ان سے نمٹا گیا تاہم یہ معاملہ سراسر سیاسی نوعیت کا تھا ــــ یہ اگر مسلمانوں کے بنیادی عقائد میں شامل ہوتا تو وہ ہر قسم کے مرتدوں کو سیفِ بُرّاں سے مٹاتے چلے جاتے ــــ اور " تاویلی " مرتد کے لئے بھی

سزائے موت ہی کا فیصلہ صادر فرماتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اور امام خطابی نے بجا طور پر یاد دہانی کرائی ہے کہ

آج کوئی بھی مرتد کسی تاویل کا سہارا لے کر سزائے موت کا سزاوار نہیں رہ سکتا (۱)

خطابی کی طرح متکلم اسلام محمد عبدہ نے بھی اپنے فکر انگیز خیالات میں۔ ان واقعات کو سیاسی نوعیت کا واقعہ قرار دیا ہے فرماتے ہیں واما ورود الاحادیث بقتل المرتد فلہ وجہ آخر من منع الحبث بالاسلام کان لہ سببٌ سیاسیٌ اجتماعیٌ الخ

"یہ جو احادیث میں قتل مرتد کے احکام پائے جاتے ہیں تو اس کا سبب ان کے عقیدے کی تبدیلی نہیں وہ "سیاسی" اور اجتماعی اسباب تھے جو بنیادی طور پر اسلام کو منہدم کرنے (من منع الحبث) کے لئے اپنائے گئے تھے۔"

(تفسیر "المنار" جلد ۹/۶۶۶ طبع مصر)

اس ضمن میں مفتی محمد عبدہٗ علیہ الرحمۃ نے وضاحت فرمائی ہے کہ

مرتد ایسے بھی ہوتے تھے جو مرتد ہوتے ہی انتقامی حرکتوں پر اتر آتے اور اپنے سابقہ حلیفوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تخریبی کارروائیاں شروع کر دیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں نے اسلامی سوسائٹی کو عملاً بے حد نقصان بھی پہنچا رکھا تھا ـــــــــــ وہ کہتے ہیں کہ۔ ایسے لوگ چونکہ امن و سلامتی کی حدود پھلانگ کر ہمہ تن قتل و غارت میں لگ چکے تھے لہذا "مدنیت" کے آداب "مملکت" کے تقاضوں اور مخالفت کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر جوابی کارروائی کرنا ضروری ہو چلا تھا۔ اب اگر کوئی ایک آدھ مرتد

(۱) بحوالہ نووی جلد ۱/۳۸

مارا بھی گیا تو حالتِ جنگ یا بغاوت کے جرم ہی میں مارا گیا۔ مذہب کی تبدیلی کی فرد جرم لگا کر نہیں مارا گیا۔

علامہ خطابی اور امام محمد عبدہٗ کی طرح ۔ صحیح مسلم کے سب سے بڑے شارح علامہ شرف الدین نووی (۱۲۷۷ھ م) نے بھی اسی حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ ۔

ان اهل الردة كانوا اصنافا منهم من ارتد عن الملة ودعا الى نبوة مسيلمة وغيره ومنهم من ترك الصلاة و الزكاة وانكر الشرائع كلها وهولاء هم الذين سماهم الصحابة كفارا

" مرتد کئی طرح کے ہوتے تھے۔ بعض تو وہ تھے جو اسلام سے منحرف ہو کر مسیلمہ کی متوازی نبوت کی طرف بلاتے تھے اور بعض وہ تھے جو نہ صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ کے تارک تھے پوری شریعت کے انکاری بھی تھے ۔ (کہ وہ متوازی شریعتوں کی سہولتوں سے دھوکا کھا گئے تھے) اور ایسے ہی لوگوں کو صحابہ کرام اپنی اصطلاح میں کافر کہتے تھے "

(شرح صحیح مسلم طبع کراچی جلد ۱/۳۸/۲۸ تا ۳۰)

پھر وہ "اشارے" کی زبان میں وضاحت کرتے ہیں کہ ــــــ مانعین زکوٰۃ مرتد ــــــ چونکہ اپنا دھن دولت بچانے کے لئے بغاوت کرتے اور سرکاری اہل کاروں و عاملین کو قتل و غارت کا نشانہ بناتے تھے[1] لہٰذا انہیں بھی پہلی صف کے مرتدوں میں شمار کر کے مرتد یعنے "باغی" قرار دیا گیا۔

نووی کی اِن تلمیحات سے پتہ چلتا ہے کہ ــــــ "ارتداد" میں زیادہ تر

(۱) اس طرح اگر کوئی مرتد قتل بھی کیا جاتا تو حکومتی عمال کے قتل کے جواب یا قصاص میں قتل کیا جاتا۔ اس کا عقیدے کی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں۔ خطابی بھی کچھ بتلانا چاہتے ہیں۔

مالدار لوگوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے مال میں خدا اور مملکت کا کوئی حق نہیں سمجھتے تھے ـــــ اس طرح یہ لوگ نہ صرف اسلامی سوشلزم کے منکر تھے خلقِ خدا کو زیر کر کے غربت و افلاس کے آہنی شکنجوں میں کسنا بھی چاہتے تھے۔ کہ سرمایہ کی نفسیات اسی کی متقاضی ہوتی ہے ـــــ الحاصل امام عبدہ اور نووی کے تجزیے سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ ـــــ قتلِ مرتد کا معاملہ "نفسیاتِ مرتدہ" سے تعلق رکھتا ہے ـــــ مرتد اگر "پُرامن" ہے تو کسی تعزیر کا سزاوار نہیں ہے۔ اور اگر شریر ہے تو ملتِ اسلامیہ کے معروضی حالات کے مطابق اس کی شرارتوں اور فتنہ سامانیوں کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے۔ یہ تھے قدیم ملّی تقاضے جنہیں ملحوظ رکھ کر کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں جن کی نہ تو قانونی حیثیت تھی اور نہ مذہبی۔ خالص اجتماعی اور سیاسی حیثیت تھی!!

جدید ملّی تقاضے

قدیم ملی تقاضوں کے مطابق۔ باغی قسم کے مرتدوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا اس کی وجوہات واضح ہو چکیں۔ اب اگر بارِ خاطر نہ ہو تو عرض کر دوں کہ ـــ اسلام جہاں حریتِ فکریہ "قدغن" لگا کر "منافقت" کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا وہاں یہ بھی اس کے مزاج کے خلاف ہے کہ۔ اختلافِ عقیدہ یا ترکِ مذہب کی آڑ میں خلقِ خدا کو تہ تیغ کرنے کا حکم دے؟ انسان صاحبِ ارادہ اور صاحبِ عقل ہے۔ اِسے بُرے بھلے کی تمیز عطا کر دی گئی ہے فالہمہا فجورھا و تقوٰہا ـــــ وہ ہدایت و گمراہی کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے اگر کسی بات کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا جائے گا تو اس سے نہ صرف قسامِ ازل کی عطا کردہ فیصلہ کن قوتیں بے کار اور معطل ہو جائیں گی۔ انسانی عقل وادراک کا احترام بھی ختم ہو کر رہ جائے گا۔ وہ تلوار کے خوف سے بے اطمینانی کی اس کیفیت پر زندہ رہنا گوارا کر لے گا جو بہ آخر

"منافقت" کی سٹیج تک پہنچانے والی ہو۔ تو کیا اسلام کسی طرح کی منافقت کا متحمل ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ صریح کفر کو تو برداشت کر سکتا ہے "منافقت" کو گوارا نہیں کر سکتا (۱)

پھر یہ بات بھی بہت الجھن کا باعث بنی رہے گی کہ کسی کو مرتد کہنے کے فیصلے کا مجاز کون ہے؟ کیونکہ صدیوں سے ہی ہوتا چلا آیا ہے کہ مذہبی لوگ اپنے مخالفین کے عقیدے کا خود ہی تعین کر کے پھر اس کی اساس پر خود ہی فرد جرم عائد کر کے قتل کراتے رہے ـــــ اب اگر آئندہ بھی اسی ہی معیار کو برقرار رکھا جائے تو امتِ اسلام کا ہر گروہ دوسرے کے عقیدے کا از خود تعین کرنے کا مجاز بن بیٹھے گا اور خود ہی دوسروں کی تکفیر میں سبقت کر کے ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتا رہے گا لہٰذا ہونا یہ چاہیئے کہ ـــــ "ارتداد" اور "تکفیر" کے لامحدود سلسلہ کو محدود کرنے کے لئے حاملینِ مذاہب کو پس منظر میں لے جایا جائے یا یہ کہ ان کی اس حد تک حوصلہ شکنی کی جائے کہ وہ اپنے ہتھکنڈوں سے باز آ جائیں یا کم از کم اسلام کو اکسپلائٹ کرنے کی عادت ترک کر دیں کہ اس طرح ہی خلق خدا کو بھی امان ملے گی اور اسلام کی رسوائی کے اسباب بھی مسدود ہو کر رہ جائیں گے۔

مانا کہ قبولِ حقائق میں کچھ گروہی مجبوریاں حائل ہیں اور ہم کھل کر اپنے قدیم احکام میں ترمیم نہیں کر سکتے۔ تو بھی سوچنا ہو گا کہ ہمارے جدید ملی تقاضے اس اندازِ فکر سے جس قدر جلد چھٹکارے کے خواہاں ہیں انہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ـــــ ہمارے لاشعور کا یہ موہوم خطرہ کہ اگر ہم نے مرتدوں کو چھوٹ دے دی تو مسلم میجارٹی سخت مشکلات سے دوچار ہو جائے گی۔ عصرِ حاضر کے وسیع تقاضوں کا جواب فراہم نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک فرماتا ہے لا یضرکم

(۱) اصطلاحی منافقت بشرطِ امکان

من ضل اذا اهتدیتم
"تمہارا اگر ہدایت (اسلام) پر پختہ یقین ہے تو کسی بھٹکنے والے (تارک اسلام) کی گمراہی تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی" (مائدہ ۵-۱۰۵)

یہ آیت ہدایت و گمراہی کے "قانون" کی وضاحت کرتے ہوئے ذہن نشین کراتی ہے کہ ــــ انسان اگر اپنے میں پختگی اور رسوخ رکھتا ہے تو دوسرا لاکھ کوشش کرے اس کے خیالات میں تبدیلی نہیں لا سکتا۔ ہم صرف "احمدیوں" کا خطرہ دکھلا کر حکومت اور ملک کے لئے مشکلات تو کھڑی کر سکتے ہیں مگر اصل "خرابی" کا تدارک پھر بھی نہیں کر سکتے ــــ آپ اگر خرابی کا تدارک چاہتے ہیں تو پہلے "اپنے" میں تبدیلی پیدا کیجئے۔ آپ کے علماء تو بظاہر یہی کہتے ہیں کہ ــــ نبوت ختم ہو چکی ہے ــــ حضورؐ آخری نبی تھے۔ اب کوئی بھی اس منصب پر فائز نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی آپ کے عقائد میں "انتظار مسیح" کی چیخ بھی لگا دی جاتی ہے سوچنا یہ ہے کہ جب نبوت کا دروازہ بند ہے تو یہ کھڑکیاں اور روشندان کس نے آ کر کھولے؟ اور ان کے کھلنے سے ختم نبوت کا تصور کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جدید علمی تقاضے ان دیو مالائی تصورات کے متحمل نہیں ہو سکتے مسیح کی تشریف آوری ہمارے لئے نہیں ہوگی وہ بنی اسرائیل کے رسول تھے ورسولا الی بنی اسرائیل (آل عمران ۴۹) اور ان اسرائیلیوں ہی کو انتظار کرنی چاہیئے ہمیں نہ انتظار ہے اور نہ ہی آج تک ہم میں کھلنے کی ضرورت اور اگر مکمل ہے تو نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر نامکمل ہے تو کسی باہر کی نبوت سے مکمل کرنے کا جواز نہیں ہے ہمیں ہر حال میں غلط انداز فکر سے کنارہ کش ہو کر عالمی تقاضوں کا احترام کرنا چاہیئے ہم اگر درجنوں سکہ بند مسائل (جن میں تبدیلی یا تعطل کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان) کو نئے انداز فکر سے طے کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ

قتلِ مرتد کے بارے میں کوئی "مثبت" راہِ عمل تجویز نہ کر سکیں؟ ہمارا طرزِ عمل ہماری گروہی سیاست اور جانبدارانہ آئیڈیالوجی سے ضرور میل کھاتا ہے لیکن انصاف کو نہ تو مذہبی اور نسلی ترازو میں تولا جاتا ہے اور نہ ہی سچائیوں کو مخصوص گروہی سانچوں میں ڈھال کر اچھوتوں کا کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔ ___ ہمارے بالغ نظر علماء "امت کی مصلحتوں" کے نام پر بہت سی تبدیلیوں اور نظرِ ثانی کے اشارے کرتے رہے ہیں[۱]۔ ہم اگر ملی مصالح کی خاطر ان کے مشوروں کو درخورِ اعتنا سمجھ کر تمام ان حدود و قیود اور پابندیوں پر نظرِ ثانی کریں تو یہ اسلام کے مفاد میں بھی ہوگا اور جدید عصری تقاضوں کے ہم آہنگ بھی

---

(۱) یہاں اُن مسائل کی تفصیل حذف کر دی گئی ہے جن میں عصری تقاضوں کے مطابق تبدیلی لائی گئی تھی۔ تفاصیل ملاحظہ ہوں۔ الاحکام السلطانیہ علامہ آمدی طبع قاہرہ جلد ۴/ ۲۱۲۔ المبسوط سرخسی (۱۰۹۰م) طبع قاہرہ جلد ۱/ ۱۴۵۔ یسر الاسلام رشید رضا طبع المنار پریس مصر ۱۹۲۸ء صـ ۴۲ وغیرہ

باب سوم

اجماعِ اُمّت

قرآن وحدیث اور آثارِ صحابہ کے بعد کچھ لوگوں نے "اتفاق" علماء کو بھی ضروریات شرع میں شمار کیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ "اجماع" کتنا ہی توانا اور پختہ ہو۔ قرآنِ حکیم کے خلاف منعقد ہو ہی نہیں سکتا ——— امروز کے ایک تجزیہ نگار کو یہ حقیقت تلخ معلوم ہوئی اور وہ فرمانے لگے کہ

"آپ ان احکام و قوانین کو نافذ کرنے سے کیسے روک سکتے ہیں جنہیں صدیوں سے فقہائے اسلام اور عوام۔ اسلامی مانتے رہے ہیں؟ اور آج بھی سو فی صد علماء۔ اسلامی مانتے ہیں[1] مخلص، سچے اور عقیدت مند مسلمان عوام۔ اسلام کے احکام و اوامر کے بارے میں اپنے مستند و مسلمہ علمائے دین کی بات سنیں گے یا ایسے حضرات کی جن کی ساری زندگی غیر اسلامی قانون کے فیصلے کرتے گذری ہو؟ اور جن میں عملی اسلام سے دور کا کبھی بھی تعلق نہ رہا ہو"

(امروز لاہور بابت ۱۰ جولائی ۱۹۶۳ء ص ۳ کالم ۵)

ہمارے نزدیک یہ لوگ علماء کے بارے میں اس قدر جذباتی اور ذکی الحس واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ ——— ادیانِ عالم میں اسلام ہی وہ دین ہے جس نے علم و عمل کو بڑے لوگوں کی شخصیات میں مرکوز کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ اسے "پاپائیت" اور "مشیخیت" سے تعبیر کرتا اور اپنے ماننے والوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ ——— اُن کی نہیں ——— دلیل اور

---

[1] یہ شذرہ۔ قتلِ مرتد کے ضمن میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے ہمارے شرعی دانشوروں کے زورِ استدلال کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔

منطق کی مانیں ____ وہ علمار کے بارے میں صاف صاف کہتا ہے کہ دنیا میں اختلاف و ضلالت نے جب کبھی زور پکڑا اس کے موجب علمار حضرات ہی بنے۔ عامۃ الناس نہ تو علم رکھتے تھے اور نہ ہی اختلافی پہلو نکال کر لوگوں کو شاخوں اور گروہوں میں بانٹ سکتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ۔ علمار باطل پہ اتفاق نہیں کر سکتے۔ لیکن حقائق اس منطق کو تسلیم نہیں کرتے۔ "فرقہ بندی" جیسے سب سے بڑے "باطل" پہ راضی ہونا اگر باطل پہ اتفاق کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟۔ حال ہی میں علمار کی اکثریت نے کروڑوں کلمہ گو مسلمانوں کو سیاسی اختلاف کی بنا پر کافر کہہ کر سب سے بڑی ضلالت پر اجماع کر کے اس نظریئے کی نفی کر دی ہے کہ۔ یہ لوگ باطل پہ مجتمع نہیں ہو سکتے؟ (۱) اِن

(۱) یہاں اس سانحۂ روح فرسا کی طرف اشارہ ہے جب علمار نے "نظامِ مصطفیٰ" کی آڑ میں لوگوں کے ایک ہاتھ میں گاسلیٹ کی بوتل اور دوسرے میں "ماچس" کی ڈبیا تھا کر حکم دے رکھا تھا کہ "پیپلز پارٹی" کے گھروں اور دکانوں کو آگ لگا دی جائے۔ اِن کے سرگرم کارکنوں کو زندہ جلا دیا جائے۔ یا نیزوں، بھالوں اور خنجروں سے گھائل کر کے تڑپتا چھوڑ دیا جائے۔ اِن لوگوں نے کلمہ گو بھائیوں کی (سوشلزم کے بہانے) عزتیں لوٹیں۔ اسلام کے نام پر عصمتوں پہ ہاتھ صاف کئے۔ قتل نفس کو مشغلہ بنایا۔ جنازے نہیں پڑھے۔ اِن کے بچوں کو مساجد میں قرآن پڑھنے سے روکا اور نامعلوم کیسی کیسی بربریت اور سفاکی کو روا رکھ کر فتنے کے عفریت کو کھلا چھوڑ دیا اور اسی طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھا کر اپنی عاقبت بھی خراب کر ڈالی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں اپنے بچوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر کے۔ گھر میں تنہا رہ کر موت کے لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی امت کے ان افراد کا جو میری ہی طرح گنہ گار تھے (متقی اور پرہیزگار نہیں تھے) شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بھیانک راتوں میں پہرہ دے کر میری حفاظت کا سامان کیا۔ جزاہم اللہ احسن الجزار۔

لوگوں نے گذشتہ پانچ سالوں میں اپنے مخالفین کے خلاف جو ناشائستہ زبان استعمال کی، ممبرِ رسول ؐ پر فحش بکا۔ بدزبانی کے جوہر کھلائے اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مساجد اور درس گاہوں اور عید کے اجتماعات کے تقدس کو ختم کر کے ایسی ننگی بازاریت اور سوقیانہ زبان استعمال کی جس سے زائیدگان ابرمن بھی شرما جائیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں یہ کہنا کہ انہی کے سہارے دین زندہ اور ملت یکمشت ہے دورِ حاضر کا سب سے بڑا فراڈ اور سب سے بڑی ڈھٹائی ہے۔ ان کی باطل پرستی کے واقعات جب معلوم ہوں گے تو آپ کی عقیدت کے آبگینے چکنا چور ہو جائیں گے۔ رہا یہ کہ عقیدت مند عوام اپنے مستند علمائے دین کی بات سنیں گے یا ۔۔ وغیرہ۔ جی یہ درست ہے کہ علماء نے مسلمانوں کو جن مختلف حلقوں اور گروہوں میں بانٹ کر لامتناہی فرقہ بندی کا پرستار بنا رکھا ہے اب لامحالہ ہر گروہ کا پجاری اپنے ہی مسلک کے علماء کی بات سننے کا احترام عقیدت سے تسلیم کرے گا۔ وہ دلیل و منطق سے کوئی غرض و اسطہ نہیں رکھے گا۔ وہ راستی اور حقیقت کا سوال بھی نہیں اٹھائے گا۔ صرف یہ دیکھے گا کہ اس کا اپنا "مولوی" کیا کہتا ہے؟ وہ متاعِ دین و ایمان جب کسی رہزنِ اخلاقیات کے ہاتھوں لٹا کر بھی مطمئن ہے، تو ظاہر ہے وہ کسی بڑے سے بڑے معلّمِ اخلاق کی بات بھی سننا گوارا نہ کرے گا، لیکن وہ اگر کسی ریش تراش اہلِ علم سے رجوع نہ کرے گا تو اس سے یہ امید بھی نہ رکھنی چاہیے کہ اپنے فرقے کے ماسوا کسی دوسرے فرقے کے متشرع و ملکوتی چہرے پر نظریں گاڑے گا؟ مودودی کی امت ہی کو دیکھ لیجیے کہ وہ جس قدر اپنے پیر و مرشد کے تقدس، مفروضہ علمی قابلیت اور ملکوتی صفات کی قائل ہے کسی اور کے بارے میں اُن کا حسنِ ظن اجازت نہیں دے گا کہ احترام و عقیدت کے قابل سمجھیں۔

اجماع برائے قتل آدم

ہماری دینی قیادت جب اپنے ترکش کا آخری تیر چلاتی ہے تو نئی حکمتِ عملی کے مطابق "اجماعِ امت" کی دہائی دینا شروع کر دیتی ہے۔ یہ اجماعِ امت کیا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیسی ہے؟ آج تک کسی بات پہ اجماع ہوا بھی ہے؟ قواعد و اصول کے مطابق اس کے منعقد ہونے کے امکانات کیا ہیں؟ ـــــ اجماع کے بار بار اعادے اور تکرار کی ویلیو کیا ہے یہ تمام باتیں سمجھے بغیر اجماع کی دہائی دینا۔ ستم ظریفی ہے راقم الحروف نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے اردو روزنامے "ملت" اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے روزنامہ "زمیندار" (بابت ۱۹۵۲ء) کی کسی اشاعت میں "اجماعِ امت" کا جائزہ لیا تھا جسے بعد میں پھیلا کر پوری تفصیل سے طلوعِ اسلام کراچی (بابت جون ۱۹۵۴ء) میں "اجماعِ امت کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں اجماعِ امت کے مفاسد کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر ثابت کیا تھا کہ ـــــ یہ نہ تو قرآن پاک کے خلاف منعقد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس میں شرع بننے کی صلاحیت ہے بلکہ اِسے تو کسی بھی صاحبِ علم کا ویٹو۔ مسترد کر سکتا ہے۔

اجماعِ امت؛ اختلافِ قرأت کے عقیدے کی روشنی میں تو آج تک قرآن پاک کے الفاظ پر بھی نہیں ہوا۔ یہاں اگر اللہ کی حفاظت شاملِ حال نہ ہوتی تو اجماعِ امت والوں نے قرآن پاک کو بھی "متنازعہ" بنا رکھا تھا ـــــ اور تعجب ہے کہ کلماتِ الٰہی میں اختلاف کا عقیدہ رکھنے والے یا یہ کہ مجموعی نظر سے اختلافِ قرأت پر ایمان لانے والے کس منہ سے اپنے کو مسلمان کہتے اور کس زبان سے "قرآن" کو غیر محرف مانتے ہیں؟

اس وضاحت کے ساتھ ہی چند تاریخی واقعات پیش کر کے اجماعِ امت کے

تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی کوشش کر دوں گا۔

نواب محسن الملک علیہ الرحمۃ (۱۹۰۷ء) نے اجماع کی بابت یہ تاثر دیا ہے کہ ——— "مسلمانوں کا تو آج تک وضو کی کیفیت پر بھی اجماع نہیں ہوا ہے حالانکہ ہر عبادت کی ابتدا وضو ہی سے ہوتی ہے"

صحابہ کرام نے حضرت ابا بکر صدیق رضی اللہ عنہ (۶۳۴ء) کی خلافت پر اجماع کر لیا تھا لیکن سیدنا علی (۶۶۰ء) نے اس اجماع کو تسلیم نہیں کیا اور بیعت سے انکار کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس پر نہ تو صحابہ کرام نے آپ پر "اجماع شکنی" کی فردِ جرم عائد کی اور نہ ہی ضابطے کے مطابق صدیق اکبر نے تادیبی کارروائی کی۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ عرصہ چھ ماہ گذرنے پر آپ نے اپنی "مرضی" سے بیعت کر کے ۔ عملاً "اجماع" پر اپنی "مرضی" کو مقدم رکھا۔

سیدنا علی کی طرح خزرجی انصار کے سردار حضرت سعد بن عبادہ (۶۳۵ء) نے بھی اجماعِ امت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت صدیقِ اکبر کی تازیست بیعت نہیں کی۔

صدیقِ اکبر کے بعد صحابہ کرام جب فاروقِ اعظم (۶۴۴ء) کی فرماں روائی پر مجتمع ہوئے تب بھی حضرتِ سعد مذکور نے تازہ اجماع کو ویٹو کیا اور زندگی بھر بیعت پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ پہلے پہل حضرت علی بھی بیعت سے انکار کر کے مسجد نبویؐ سے باہر چلے گئے تھے تاہم بعد میں جلد ہی کسی موزوں وقت پر بیعت کر ڈالی تھی۔

فاروقِ اعظم کے بعد جب ذی النورین سیدنا عثمان غنی (۶۵۶ء) کی امارت کا مرحلہ آیا تب بھی حضرت علی نے اس اجماع کا ساتھ نہیں دیا حتے کہ دو ہم زلفوں کی چشمک نے حضرت علی کو بیعتِ رضوان توڑنے پر بھی مجبور کر دیا اس

کے باوصف اہلِ اجماع نے آپ کو نہ تو ملعون کیا اور نہ ہی کسی تعزیر کا فتویٰ دیا۔ "ترکہ" میں "عَول" کا مسئلہ مشہور ہے۔ صحابہ کرام کا مسلک تھا کہ ترکہ میں جب حصہ دار زیادہ ہوں تو ضابطۂ "عول" کے مطابق تقسیم عمل میں آئے گی۔ لیکن صحابہ کے اس اجماع کو عبداللہ بن عباس (۶۸۷ء م) کے ویٹو نے کمزور کر دیا تھا۔ اسی طرح یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کرنے پر علماء کا اجماع ہے مگر عترتِ نبیؐ اور معتزلہ۔ اس اجماع کو نہیں مانتے ۔۔۔۔۔ صحابہ کرام سفر میں روزے رکھنے پر اجماع کر چکے تھے مگر عبداللہ بن عمر (۶۹۲ء م) اور ابو ہریرہ (۶۷۶ء م) نے اس اجماع کو چیلنج کر رکھا تھا۔

ماضی میں چاروں سُنّی مذہب کے فقہاء نے اجماع کر رکھا تھا کہ جو طلاق صفت یا شرط سے معلق ہو گی واقع سمجھی جائے گی۔ لیکن بعد میں اس اجماع کی پرواہ نہیں کی گئی۔

پس جب اتنے صحابہ کرام اپنے دور کے "اجماعِ امت" کو ویٹو کرتے رہے اور کسی نے ان کو اجماع شکنی کے حوالہ سے طنز و تعریض کا نشانہ نہیں بنایا تو "قتلِ مرتد" جس پر اجماعِ امت سرے سے ہوا ہی نہیں اس پہ اجماع کا حصار کیونکر کھینچا جا سکتا ہے؟ ان لوگوں نے تو آج تک مسلم کی سائنٹیفک تعریف پر بھی "اجماع" نہیں کیا۔[1] یہ تو متفقہ طور پہ یہ بھی نہیں بتلا سکے کہ "گستاخِ رسول" کی نقطی تعریف کیا ہے۔

---

(۱) جسٹس منیر لکھتے ہیں کہ ۔۔۔۔۔ "اس حقیقت کو بھی ذرا ذہن میں رکھئے کہ اس سوال کے جواب میں کوئی دو عالم بھی متفق نہیں نکلے کہ "مسلمان" کسے کہتے ہیں؟ نیز ان علماء نے مسلمان ہونے کی جو شرائط بیان کی ہیں انہیں اگر بہ حیثیتِ مجموعی دیکھا جائے تو ہر شخص کے "ارتداد" کے لئے بے شمار وجوہات موجود ہوں گی۔

۔۔۔۔۔ (منیر تحقیقاتی رپورٹ انگریزی ایڈیشن طبع پنجاب گورنمنٹ پریس لاہور صفحہ ۲۱۹)

ان واقعات کی روشنی میں جو لوگ انسانوں کی تقدیر کے فیصلے اجماعِ امت کے حوالہ سے کرتے ہیں وہ نہ بھولیں کہ آج بین الاقوامی دور ہے ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ بین الملکی روابط اور اقلیتی حقوق کے عالمی ضوابط پوری آب و تاب سے نافذ ہو رہے ہیں۔ پاکستان نے بھی حقوقِ انسانی کی سفارشات پر دستخط کئے ہیں۔ ایسے میں عالمی معاملات کی نفسیات سے شناسائی اور عالمی روابط کے تقاضوں کا ادراک نہ رکھنے والے۔ کوتہ نظر علماء سے خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ خاص کر مشاہدہ گواہ ہے کہ ——— ہر دور میں قدامت پسند لوگ طاقتور ہوتے ہیں اور ہر زمانے میں وہ اپنے طور پر قوانین کی تشریح کرتے ہیں ——— اس طرح ملاں اور ملوکیت کا جو گٹھ جوڑ کل تھا وہ اسلامی ملکوں میں آج بھی ہے اور جو لوگ عالمی سطح پر نہ سہی ملکی سطح پر ہی سہی رویتِ ہلال جیسے معاملہ میں بھی متفق نہیں ہو سکتے انہیں اگر "اجماعِ امت" کی اندھی لاٹھی ہاتھ میں تھما دی جائے تو کسی بھی فرد کی حفاظت کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ "اجماعِ امت" نہ دین ہے اور نہ ہی اس میں "دین" بننے کی صلاحیت ہے۔ دین مکمل ہے۔ نبی کے بعد اس کی تکمیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ علماء نہ انفرادی طور پر "نبی" ہیں اور نہ ہی اجتماعی طور پر درجۂ "نبوت" پر فائز۔ لہٰذا ان سے دین کی کسی خامی کی اصلاح کے لئے رجوع کرنا یا ان کی کسی خود ایجاد "تشریح" کو دین سمجھنا منصبِ نبوت کے حساس تقاضوں کے منافی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ

عملاً غیر اسلامی زندگی گذارنے والے اسلام پسندوں کو ہی مشکل درپیش ہے اور اس سے راہِ فرار ڈھونڈنے کے لئے وہ اس

طرح کی تحقیقات کرتے ہیں۔

(امروز لاہور - ۶/۱۰/۱۹۷۲ ص۳ کالم ۵)

جی ہاں ذرا اور بھی کھل کر بات کیجئے۔ آپ کا کھلا طنز اور اینٹھا ہوا لب ولہجہ واضح کرتا ہے کہ "قتل مرتد" پر لکھنے والے داڑھی منڈے اسلام کی اگر حقانیت بیان کریں تو انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کیونکہ وہ بالوں کی نعمت سے محروم ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اجارہ داری کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر آپ کسی بھی کلمہ گو مسلمان کو حق بات کہنے کا حق نہیں دیتے تو براہِ کرم یہ فرمایئے کہ "بالوں" کو ایمان، اسلام، علم اور دانش کا جزو بنانے کے لئے آپ کے پاس کون سی دلیل ہے؟ آپ کو چاہیئے کہ اتنی تنگی جارحیت کے لئے وہ دلیل سامنے لایئے جس کی رو سے مسائل و احکام کے بارے میں تحقیق کا حق صرف متشرع چہروں کو سونپ دیا گیا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو آپ کی منشا کے برعکس ایمان کی بابت فرما دیا ہے کہ - ان اللہ لاینظر الی صورکم ولا الی اعمالکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم۔

"اللہ سبحانہ تمہارے اعمال اور شبیہ چہروں کو نہیں دیکھتے۔ اس کی نظر تمہارے دلوں پر ہے کہ دل ہی ایمان کا منبع ہے۔"

(صحیح مسلم)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ معیار کی توثیق وحیِ الٰہی کے حسب ذیل اشارے سے بھی ہوتی ہے کہ - لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم۔

"تمہاری بہترین نیکیاں اللہ کی راہ میں قربانیاں ہیں لیکن سوچ رکھو کہ اللہ کے پاس ان قربانیوں کا گوشت و پوست نہیں پہنچتا اس

کے پاس تمہارے دل کا خلوص پہنچتا ہے" (حج ۲۷:۲۲)
یہ ارشادات واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ظاہری اعمال پہ ان کے عقائد کا تعین کرنا یا۔ لباس اور چہرے کی مخصوص وضع کو علم و بصیرت کا خاصہ قرار دینا خود ساختہ اور مردود معیارِ تشخیص ہے۔

قرآن کی اشاعت کیونکر ہو؟

یہ ایک حقیقت ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ۔ "قتل مرتد" کی موجودگی میں "فلسفۂ حریت" بالکل بے معنے ہو جاتا۔ اور اسلام کی عطا کردہ آزادیٔ فکر و نظر مفلوج اور بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس سے جہاں انسان کا "ارادہ" متاثر ہوتا ہے وہاں اسلام کی طرف راغب ہونے میں کوئی کشش بھی باقی نہیں رہتی۔ ارتداد سے بچہ روکنا۔ یا مرتد کو جہنم واصل کر دینا ہی اگر مطلوبِ شرع ہوتا تو ایسے بنیادی مسئلہ کے بارے میں وحیِ الٰہی خود ہی کوئی وضاحت فرماتی۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ درجنوں آیات تو انسان کے خود اختیار کردہ عقیدے میں مداخلت سے روکنے پہ مشتمل ہوں انہیں تو نظر انداز کر دیا جائے اور بار سے مقابلے کی ایک آدھ حدیث بنا کر اس کی اساس پہ قرآن کی عطا کردہ حریتِ فکر و عقیدہ کو مسل کر رکھ دیا جائے؟

یوں تو ہمارے علماء حضرات۔ یا دریوں اور دل یورپ کو تعصب و تنگ نظری کا طعنہ دیتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق سب کو مساوی دے رکھا ہے جب کہ یہاں آئے دن یہی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ غیر مسلموں کو تبلیغ و اشاعت کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ اب فرض کرو۔ ملاں نواز کوئی حکومت اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر ان کا یہ مطالبہ مان لیتی اور غیر مسلموں کے اظہار و دعوتِ عقیدہ پہ پابندی عائد کر دیتی ہے تو ایسی صورت میں یورپ والوں پہ کسی طرح

کی طنز و تعریض کا جواز کیا رہ جاتا ہے؟ اور پھر وہ کون سی طلسماتی صورت ہو گی جو اسلام کو خود کار حیثیت سے دلِ یورپ میں متعارف کرائے گی؟ یہ قطع نظر اس کے کہ وہاں پہنچ کر ہمارے پیشہ ور مبلغین جس طرح اسلام کا "مُثلہ" کر کے بدنما صورت میں پیش کرتے ہیں وہ خود ہی بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اب کسی کو وہاں قانونی رکاوٹ ڈالنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی۔

یہ یاد رہے کہ وہاں تعصب کی "تکنیک" بالکل ہی بدل دی گئی ہے اب کھلی جارحیت کی بجائے تنگ ظرفی کو جدید اسلوب میں ڈھالا گیا ہے وہ اسلوب جس کی باریکیوں اور توانائیوں کا ہمارے پیشہ ور مبلغین احساس ہی نہیں کر سکتے (۱)

ارتداد کا سفر جاری ہے

قائینِ محترم وحیِ قرآن کی پالیسی غیر مبہم اور واضح ہے کہ انسان کو ضمیر کا مجرم نہیں بناتی حریتِ فکر عطا کر کے جادہ پیمائے حقیقت بناتی ہے۔ اس طرح اس کی پالیسی احادیث و آثار کے مفہوم سے مختلف ہو جاتی ہے لیکن تعجب ہے کہ جو بات اتنی وضاحت اور صفائی سے کہی گئی ہو اُسے نہ تو پذیرائی بخشی گئی اور نہ ہی یقینی تسلیم کر لیا گیا۔

بیٹھے ہوئے ہیں جہل کے پہرے علوم پر
لب بستہ ہے نبوتِ بشر ہنوز
جوش

(۱) ہمارے مبلغین کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہاں اسلام کو حسن و خوبی سے متعارف کرانے کی بجائے مسلمانوں کو لڑا کر۔ اپنی جیبیں زر و جواہر سے بھر کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔ لیکن یورپ والے اگر حقِ تبلیغ روک دیں تو نہ وہاں کوئی چپقلش اور فساد ہو نہ یہ لوگ خوش بختی کے حامل

ہم سمجھتے ہیں اور قرآن سے بے بہرگی کا یہ فلسفہ قابلِ فہم ہے کہ دلوں میں اس کی عظمتوں کے چراغ روشن نہیں ہوئے جب کہ عظمت کا ماحصل ہی یقین ہے جب کہ یہاں وہم و گمان کے دھاروں کو خیرباد کہنے کا اہتمام ہی نہیں ہے اور یقین زبانی دعودں سے پیدا نہیں ہوتا وہ ایسا آفتاب ہے جس کے لئے غروب نہیں ہے جب کہ ستارے شام کی پلکوں میں اس وقت ہی رقص کرتے ہیں جب جمالِ آفتاب چھپنے لگتا ہے اور جب آفتاب ہو تو ستارے نظر نہیں آتے یعنے کہ یقین کا منبع قرآن ہے لیکن تعجب ہے کہ وحیِ قرآن کا خورشید۔ روشن و تابان ہے پھر بھی اندھیروں کے مسافروں کو راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ جو لوگ اپنی خامکاری میں بھی خام ہیں رخسارِ قرآن کی لپک انہیں محسوس ہی نہیں ہوتی۔

انہیں طلوعِ سحر کا شعور ہو کیوں کر ؟
جو ظلمتوں کے سمندر میں ڈوبتے ہیں
ارشد ملتانی

لیکن اس بد عقیدگی اور ذہنی کمد کاوش کے باوصف ہمارے دینی خداؤں نے جتنا کچھ سیلابِ بدّت کو روکنا چاہا۔ ارتماد کا ایک ہی ریلا۔ ان خداؤں کو خاشاک خس کی طرح بہالے جاتا رہا۔ کیوں کہ اسلام اگر "خیر" ہے اور ارتداد "شر" تو ضابطہ کے مطابق خیر و شر کے تناظر میں "شر" کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا ورنہ تو صداقتوں کی پہچان مبہم ہو جائے گی۔ مسیح کے ذکر میں احساس دلایا ہے کہ "جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا (۱) (عمران ۵۵)

یہاں خیر و شر کو ایک دوسرے کی پہچان کا ذریعہ ٹھہراتے ہوئے بتلایا ہے کہ

(۱) یعنی آویزشِ حق و باطل قیامت تک جاری رہے گی۔ باطل کو اگر مصنوعی طریقوں یا جبر سے مٹایا گیا تو قرآن کی رو سے حق کی تابانی کا امتیاز نمایاں نہ ہوسکے گا۔

ثم الی مرجعکم (پھر سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے (عمران، ۵۵) یعنی حق و باطل قدم قدم ساتھ چلیں گے ایسا نہیں ہے کہ باطل پرستوں کو تہ تیغ کر کے ان کی نسل ختم کر دی جائے گی۔ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اس سے صداقت کا حسن اور خوبی گہنا جائیں گے اور حق پرستوں کی پکار۔ صدا بہ صحرا ثابت ہوگی۔ روزِ حشر جب تک خیر و شر مقابل میں کھڑے نہ ہوں۔ تنہا خیر کی افادیت کا اظہار کیوں کر ہوگا؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ جنت اکثر اوقات غیر فطری حربے استعمال کرنے کے خوگر بن جاتے ہیں اور انہوں نے مشاہدہ کر لیا ہوگا کہ باطل کو دبانے کے لئے جتنے بھی غیر فطری حربے کام میں لائے گئے وہ ناکام ہوتے رہے بلکہ آتشِ باطل کی لو۔ ان کے گھاس پھونس کے حقیر جھونپڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ اب نہ حدیثوں کا فائر بریگیڈ کام دے رہا ہے نہ فتووں کی آب پاشی۔ روزنامہ جنگ لاہور نے چوکھٹہ دے کر ایک سروے رپورٹ پیش کی ہے جس سے پاکستان اور جکارتہ میں "ارتداد" کی رفتار کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مسیحی مشنریوں کی کوششوں سے انڈونیشیا کی بیس فیصد آبادی عیسائی ہو چکی ہے جب کہ چند برس قبل انڈونیشیا میں اٹھانوے فی صد آبادی مسلمان تھی۔ ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں مسیحی آبادی گذشتہ دس برس میں چوالیس فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھی جب کہ مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی شرح پینتیس فیصد ہے ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں عیسائیوں کی تعداد دس ہزار تھی جو اب ۱۴ لاکھ کے قریب ہے۔"

(جنگ لاہور ۸۶-۱۱-۱ صفحہ ۸ کالم ۲)

یہ رپورٹ پڑھ کر خرد کے پر و بال جل جاتے ہیں کہ ہمارے دینی توپخانے

جہاں اپنے ہی کلمہ گوؤں پہ گولہ باری کرتے رہے اب ان کے پاس جدید تکنیک کے مطابق اتنا بھی استعمال کرنے کا بارود نہیں کہ اسلام کو غیروں کی یلغار سے بچا سکیں۔ اب تو ان سے کنارہ کشی ہی میں سلامتی ہے۔

ہے جن کا ظرف حقیقت میں تنگ میخانہ
اب ایسے بادہ گساروں کو خیر باد کہو
ارشد ملتانی

وہ کہتے ہیں کہ حیات کی زلفیں سنوارنے کے لئے مشاطۂ قرآن غیر کافی ہے لیکن وہ نہیں سوچتے کہ اتنی بداعتمادی کے باوصف وہ احادیث اور فتاوے بھی کافی نہیں ہو سکتے جو زلفیں سنوارنے کی بجائے سر کی کھال ہی کھرچ دیتے ہیں۔ وحی کی ہموار شاہراہیں اگر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتیں تو دینی خداؤں کی بتلائی ہوئی پگڈنڈیاں بھی کاشانۂ محبوب کی گلیوں کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ اب تقاضائے وقت کی یورشوں کے سامنے دانشِ فقیہہ سپر انداز ہو رہی۔ اور یہ کوئی خفا ہونے کی بات نہیں ہے۔

خفا نہ ہو کہ ہے عصرِ جدید گرم خروش !
کہ مردہ ہے وہ جوانی جو پھونکتی نہیں صور
جوش

ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کی مجبوریاں کیا ہیں؟ اور حکمتِ قرآن پہ غور کرنے میں رکاوٹیں کیا کیا حائل ہیں؟ لیکن انحراف و تردید کے لئے کچھ سلیقہ چاہیئے۔ وحیٔ الٰہی کی بابت کھلے منہ لب کشائی کرنا اچھا شگون نہیں ہے۔ غیر تو یہی کہیں گے کہ جس قرآن کو ماننے پہ اپنے ہی تیار نہیں وہ غیروں کو مائل کرنے کا ہنر کیا رکھ سکتے ہیں؟ صداقت کا خمیر چونکہ تلخیات سے اٹھتا ہے لہٰذا ہمارے اکابر تلخ پہ شیریں کو پسند فرما دیں گے چاہے ایسی شیرینی موت ہی کا باعث کیوں نہ بنے؟۔ زیست کے پراسرار دشت میں آبلہ پائی سے پاؤں چونکہ فگار ہو جاتے ہیں لہٰذا

ہمارے سہل پسند علماء ادھر کا رخ نہیں کرتے لیکن انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ نگار پیا۔ کے بعد جب فشار تھکن کا مرحلہ آتا ہے یعنے منزل پانے کے بعد جو سکون ملتا ہے بداعتمادی کے کھلونوں سے کھیلنے والے اس کا احساس نہیں کر سکتے موت کا سودا اگر صرف ڈنڈے کا کاروبار ہی کر سکتا ہے کہ اس کی متاعِ فردِ خت میں نرمی اور تحمل نامی کوئی چیز نہیں ہے وہ ایسی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتے کہ جب انہوں نے کسی معاملہ میں بردباری اور حکمتِ عملی سے کام لیا ہو انہوں نے صرف ڈنڈا سنبھال رکھا ہے بلکہ دین میں ہوش وخرد سے کام لینے کو دین کی نفسیات ہی کے خلاف تصور کر لیا ہے وہ یہاں تک الٹی میٹم دے رہا ہے کہ۔ قرآن یا اس کی مبادیات جو اس کی نقش " انا "کے خلاف ہوں انہیں آہنی پنجوں سے کچلا جائے گا۔ مسلمان اور اپنے ہاتھ سے " صرف " قرآن کو محو کر رہا ہے بلکہ عبادت گاہوں کی پیشانی کی طرح " کلمہ طیبہ " کو لوحِ قلب سے بھی کھرچ رہا ہے۔ آہ

بازیچۂ اطفال ہے یہ کفر یہ ایماں
میں کفر سے آشفتہ ہوں ایماں سے پریشاں } جوش

انحراف کی پہلی مثال

انحراف کی ایک مثال تو " قتل مرتد " کی ہے جس کی وجہ سے علماء کا وحی کی بابت منفی رویہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ کہ وہ انصاف کو مذہبی پیشلٹی سے مربوط نہیں کرتا۔ لایجرمنکم شنأن قوم علی الا تعدلوا۔اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی ہ اور یہ " عمل " کو بہر قیمت فرقہ واریت کے عفریت پر سوار کرنا پسند کریں گے حالانکہ

ہندو ہو یا مسلمان، بابی ہو یا مسیحی
تیری بادری سے کوئی نہیں ہے باہر

لیکن مشاہدہ گواہ ہے کہ وحی کی تعلیم کے برعکس مسلمان کا غیر مسلم اقلیتوں سے نہ معاشرتی برتاؤ قابلِ رشک ہے اور نہ مذہبی رواداری قابلِ ذکر ۔ زبانی جمع خرچ ضرور ہے مگر عملی طور پر معاملہ صفر ہے ۔ پاکستان کے P.M مسٹر M.K نے کرسمس کے میلہ (۱۹۸۶ء) کے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"پاکستان میں ہر ایک کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ہے مگر اقلیتوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی اور ان کو مساوی حقوق فراہم کرتی رہے گی وہ مذہب کی بنیاد پر امتیاز کی پالیسی میں یقین نہیں رکھتی"

لاف زنی کی حد تک بات واضح ہے لیکن عملی طور پر الجھی ہوئی ۔ بلکہ اسلامی منافقت کا جیتا جاگتا شاہکار ہے اور روزنامہ امن ۔ کراچی کے جمعہ خاں کو بجا طور پر کہنا پڑا کہ

"اگر پاکستان میں اقلیتوں کی وہی صورت حال ہے جس کی تصویر وزیرِ اعظم نے پیش کی ہے تو اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کو حکومتِ پاکستان کے ایک آرڈیننس مجریہ (۱۹۸۴ء) پر اس تبصرہ کی کیا ضرورت تھی کہ یہ آرڈیننس ایک مذہبی اقلیت کے اس حق کی خلاف ورزی ہے جس کے تحت ہر انسان اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے میں آزاد ہے ۔ اس کمیشن نے احمدیوں سے متعلق مذکورہ آرڈیننس منسوخ کرنے پر بھی زور دیا تھا"

(امن ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۲ کالم نمبر ۱)

پھر لکھا ہے کہ

"اب امریکی ایوانِ نمائندگان میں ایک رکن مسٹر ٹونی پی ہال کی قرارداد منظور کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ۔ حکومت پاکستان ۱۹۸۴ء کا آرڈیننس منسوخ کر کے احمدیوں سے امتیاز اور ان کے خلاف مقدمات ختم کرے" (حوالہ مذکورہ)

اقوام متحدہ اور امریکی ایوانِ نمائندگان کی قراردادوں کی روشنی میں پاکستانی برانڈ مسلمانوں کی دوعملی پالیسی کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں اگر ہر ایک کو اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہوتی تو جمعہ خاں کے بقول "احمدیوں، لاہوریوں اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دے کر ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کیوں کی جاتی اور ان کے لئے یہ قانون کیوں بنایا جاتا کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق عبادت نہیں کر سکتے اگر ان کو اقلیت قرار دے دیا گیا تھا تو انہیں بھی مساوی حقوق ملنے چاہیئے تھے مگر ان کو ملازمتوں سے محروم کیا جا رہا ہے" (امن حوالہ مذکور)

یہاں اس تلخ حقیقت کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ۔ پاکستان میں جس رفتار سے اسلام کا اسراف کیا جا رہا ہے اندیشہ ہے کہ آگے چل کر اختلافِ عقیدہ کے باعث خود مسلمانوں کی خرید و فروخت کا اہتمام بھی ہو سکتا ہے کیونکہ مذہب کے سرکش ٹٹو پر سوار ہونے والا یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے گھوڑے کے پاؤں تلے رُوند جانے والا۔ اپنا ہے یا بیگانہ؟

گردوں سے نہ گیتی سے نہ گیہاں سے پریشاں
میں ہوں فقط اس طبعِ تنک جاں سے پریشاں
(جوشؔ)

انحراف کی دوسری مثال

ایک مسئلہ سنگساری کا ہے جس کی بابت قرآن واضح ہے اس نے جرم زنا

کے لئے قتلِ نفس کا نہ تو کہیں اشارہ کیا ہے اور نہ ہی تصور دیا ہے اس کے باوصف عبارت ملاحظہ ہو کہ سیدنا ابنِ خطاب کے حوالے سے "رجم" کو بھی قرآن ہی کہا گیا ہے ایسا قرآن جسے بعد میں حذف بھی کر دیا گیا ہے یعنے انسانی دست برد سے اس کے الفاظ دائرہ حفاظت سے نکل گئے صرف مفہوم باقی رہ گیا۔

یہ تصور نفسیاتِ وحی سے بدترین مذاق بھی ہے اور نظریۂ حفاظتِ قرآن کے منافی بھی لیکن خداوندانِ اسلام کہتے ہیں کہ دین میں تشریح پر نظر ہوتی ہے متن پر نہیں ـــــ لیکن یہاں تو تشریح ہی ایسی ہے جو متن کی صریح تکذیب کرتی ہے۔ پھر تشریح کے لئے الفاظ کا جو جامہ تراش لیا گیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے الشیخ و الشیخۃ اذا زنیا فارجموھما

"عورت اور مرد اگر عمر رسیدہ ہیں اور شادی بھی نہیں کر پائے اگر زنا کے مرتکب ہو جائیں تو انہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دو"

بات کیا ہوئی کہ عورت و مرد اگر نوجوان ہیں اور شادی بھی کر لی ہے اگر زنا کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو عمر رسیدہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سزا "رجم" نہیں ہے۔

غور فرمائیے کسی بھی لغت، ادبی شہ پارے اور شعری لٹریچر میں "الشیخ" اور "الشیخہ" کو شادی شدہ کے مفہوم میں ذکر نہیں کیا گیا مگر ہمارے خداوندانِ مذہب کا اصرار ہے کہ جو مفہوم انہوں نے متعین کیا ہے وہی صحیح ہے اور اس کی صحت کی اساس یہی فیصلہ قرآن پہلے مبہم دوسرے مرحلہ پر مسترد ہے۔ راقم الحروف نے تفسیر "منسوخ القرآن" کے پہلے اور دوسرے باب میں مسئلہ سنگساری کا ہر زاویہ سے جائزہ لیا تھا بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ مجھ سے پہلے اتنی شرح و بسط کے ساتھ اس مسئلہ پر شاید ہی کسی نے لکھا ہو۔

اور اسی سے متاثر ہو کر کوئٹہ کے عزانفس نویس ملک غلام کبریا صاحب گگے زئی نے وفاقی شرعی عدالت سے رجوع کیا۔ عدالت نے علامہ محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری مرحوم و دیگر جدید علماء سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کو کہا۔ بعد میں قرآنِ پاک اور ماہرینِ سنت کی اِن آراء کی روشنی میں فیصلہ دیا کہ ـــــ "رجم کا قرآن پاک یا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے" عدالت کے اس فیصلہ کو روشن خیال طبقہ نے بے حد پسند فرمایا اور اس امید کا اظہار کیا کہ اس سے نوعِ انسان کی قوتِ استدلال ـــــ اوہام، روایات اور فکری جمود کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے گی ـ مگر قدامت پسند مذہبی حلقوں نے وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ حکومت نے اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی ۔ سپریم کورٹ نے مشورہ دیا کہ اپیل کی بجائے اسی عدالت سے نظر ثانی کروائی جائے ۔ دریں اثنا وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس صلاح الدین ریٹائرڈ ہوئے اور علمائے کرام میں سے دو نئے جج وفاقی شرعی عدالت کے رکن بنا دیئے گئے ۔ پھر جو فیصلہ ہونا تھا وہ آپ کے سامنے ہے یعنے نظر ثانی کے بعد اس نئی عدالت نے پہلے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر ـــــ رجم کو اسلام کا جزوِ لاینفک ٹھہرا دیا ۔ یہ فیصلہ ایک عام فیصلہ نہ تھا اس کے دور رس اثرات تھے ۔ اس فیصلے نے عدالت کے لئے رہنما اصول مہیا کئے کہ ارباب اختیار کو اسلام کی کون سی تشریح مطلوب ہے؟ جس سے عدلیہ کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل کا کام بھی نسبتاً آسان ہو گیا ـــــ مگر فطرت کے ارتقائی رجحان کا شعور رکھنے والے مجتہدین کا یہ خواب کہ نئے زمانے اور بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی فکر کے بنیادی سرچشموں کی از سرِ نو تعبیر و تشریح کی جانی چاہیئے ۔ پریشان ہو گیا ۔ شاہ ولی اللہ،

سرسید، مفتی عبدہ، علامہ اقبال اور اس قبیل کے سینکڑوں حساس بزرگوں نے جس "ملائیت" اور "مذہبی پیشوائیت" کو دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا تھا وہ پاکستان میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔

اقوال کی زمیں پہ کھڑی ہیں عمارتیں
انکار کا احاطہ ہے بے سقف و در ہنوز
ہوتا ہے ضبط سرحد و ساحل پہ مالِ عقل
ممنوع ہے درآمدِ فکر و نظر ہنوز

انحراف کی تیسری مثال

غلامی یعنے انسانوں کو جائیداد منقولہ کی طرح خرید، فروخت، ہبہ اور تملیک کر دینا۔ یہ غلام منڈی سے خرید کر ملکیت بنا لئے جائیں یا جنگ میں گرفتار ہو کر غنیمت کے طور پر تقسیم ہو جائیں۔ قرآنِ پاک نے آخری پالیسی دے کر آئندہ کے لئے کم از کم جنگی قیدیوں کی غلامی کو بیک جنبشِ قلم روک دیا اور خرید و فروخت کی غلامی کو ایک لمحہ کے لئے بھی پسند نہیں فرمایا لیکن مسلمانوں نے قرآن کے اس حیات آفرین فیصلہ کو مسترد کر دیا اور کھلے بندوں انسانوں خاص طور پر عورتوں کی تجارت جاری رکھی۔ یہ انسان ہبہ، تملیک، مبادلہ اور تحفہ میں دیئے جاتے اور ورثہ میں بھی تقسیم ہوتے تھے بلکہ فقہاء کے فلسفہ کے مطابق اِن لونڈیوں کو مہمانوں کی تواضع اور شب کو آغوشِ گرم کرنے کے لئے استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنے راج میں کمزور انسانوں کا سماجی رتبہ گھٹا کر مویشیوں اور ڈنگروں کے درجے پر رکھا تھا آج بھی اگر شریعت کا نفاذ ممکن بنا دیا جائے تو پھر سے انسانی جسم کا کاروبار فروغ پا سکتا ہے ـــــ انگریز جب یہاں آئے تو اپنا لادینی نظام رائج کیا۔ ہندوؤں کے ہاں ستی کی غیر انسانی رسم کو حکماً ختم کیا اور مسلمانوں میں رائج ننگِ انسانیت رسم غلامی کو بھی (۱۸۴۳ء) میں ایک ایکٹ کے ذریعہ منسوخ کر دیا اس طرح جاگیرداروں اور پیروں کے نرغے سے

ہزاروں غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرا دیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں کے احترام آدمیت کے دور سے برسہا پہلے۔ وحی الٰہی نے اس ننگِ انسانی بلکہ حرام کاروبار کو یک قلم روک دیا تھا مگر انسانی گوشت کے عادی ملوک اور ان کے زرخرید ملاؤں نے قرآن کے حکم کو تسلیم نہیں کیا اور انسانوں کے حرام کاروبار کو جاری رکھ کر اپنے لئے ابدالآباد کے لئے جہنم واصل ہونا گوارا کر لیا بلکہ آج بھی اگر مسلمانوں کی شومئ قسمت سے فقہِ ملّا نافذ ہوا تو۔ غلامی کے اجرار کے بغیر نامکمل ہی رہے گا۔ تاہم بفیضِ فکرِ نو جہالت کی سیاہ چادر کے تار تار ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اب گردشِ دوراں کا قافلہ تیز خرامی سے کاخِ حریت کی طرف رواں ہے۔

اوہام خوردہ اہلِ جہاں کے قلوب پہ
افکارِ نو کی دھاک بٹھلاتے رہیں گے ہم

انحراف کی ایک اور مثال

سیاست اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ گذرا وقت واپس نہیں آتا انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ماضی کی طرف جھانک سکے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ مستقبل پہ ماضی کو مسلط کر سکے۔ کسی بوڑھے کو جوان اور کسی جوان کو شیر خوار بچے میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسانی تاریخ آگے کا سفر کر رہی ہے اور ارتقائی عمل کا پہیہ کسی صورت بھی اُلٹا نہیں گھمایا جا سکتا۔ ہر لمحہ ایک تبدیلی لاتا ہے۔ ہر سال ایک تبدیلی لاتا ہے۔ ہر صدی ایک تبدیلی لاتی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال میں اتنی تبدیلیاں آچکی ہیں کہ دنیا کے نقشے سے کئی ملکوں کے نام تک مٹ گئے اور جغرافیہ تبدیل ہو گیا۔ مگر تبدیلی نہیں آئی تو ہماری دینی قیادت کے قلب و نظر میں نہیں آئی وہ آج بھی اسی پہ مصر ہے

کہ جو کچھ ہمارے اسلاف کہہ گئے ہیں وہی برحق اور ثواب ہے۔ زمانہ جو کہ وقت کا رہبر اور امام ہے وہ جو بھی رہنمائی کرے قابل پذیرائی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف قرآنِ حکیم سے ترقی پسندانہ فلسفہ اور تعلیمات سے الرجک ہے۔ جن مسائل کے بارے میں زبانِ وحی ساکت ہے انہیں بھی دین کا درجہ دے کر وحی کے مترادف قرار دے رہا ہے۔ شفعہ کا بالواسطہ یا بلا واسطہ قرآنِ حمید میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ جن احادیث پر انحصار ہے وہ بھی مزارع کے حقِ شفعہ کی نفی نہیں کرتیں پھر انسانی معاشرے کے ارتقار کے ساتھ ساتھ فلاح و بہبود کے معیار بدلتے رہتے ہیں وقت کا تقاضا تھا کہ مزارع کا حق چھینا نہ جاتا۔ جن دنوں یہ مسودۂ قانون۔ مجلس شوریٰ میں پیش تھا ان دنوں اضلاع کیمبل پور، میانوالی وغیرہ میں بعض جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی طرف سے اراضی فروخت کے انتقالات کے خلاف اُن کے مزارعین نے شفعہ کے مقدمات عدالتوں میں دائر کر رکھے تھے کیونکہ بھٹو شہید علیہ الرحمتہ نے اللہ کی کمزور مخلوق "غریب" مزارع کو شفعہ کا حق دے رکھا تھا مگر یہ جاگیردار انہیں مالکِ زمین نہیں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ ان بڑے زمینداروں نے مجلس شوریٰ کے اندر "مذہبی گروپ" کے ارکان کو اپرو چ کر رکھی تھی چنانچہ۔ اب حالت یہ تھی کہ جب مجلس شوریٰ کے رکن ایک وکیل نے مزارعین کے حق میں زوردار دلائل پیش کئے تو "مذکورہ گروپ" نے بھٹو علیہ الرحمتہ کے قانون کو "مداخلت فی الدین" کہہ کر مزارعین کو انحرافِ دین کے نتائج کی دھمکی دے دی۔

غور فرمایئے جن لوگوں کا دینی شعور نقطۂ انجماد سے بھی نیچے گر چکا ہو ان سے کسی طرح کے ملی سود و زیاں کی بابت آگہی حاصل کرنا سادہ لوحی کی انتہا ہے۔ بس مسلمان زندہ سوچ کی بدولت کچھ عرصہ زندہ رہا اور جب سے فکری انتشار کا شکار

ہو کر قومی موت مر چکا ہے اس کے بعد نہ اس کی سوچ ہی درست ہے اور نہ ہی کوئی عمل سود مند۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ امتِ محمدی ہوئی ہے آج پر خلل　　　نہ علم ہی درست ہے نہ ٹھیک ہے کوئی عمل
میں سوچتا تھا روز و شب یہ کیا ہوا یہ کیوں ہوا؟　　　خدا نے صاف کہہ دیا لکل امۃٍ اجل

انحراف کی مذکورہ مثالوں میں جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق انسانی مسئلہ سے ہے لہٰذا قرآن نے صدیاں پہلے اپنی رحیمانہ پالیسی کے مطابق انہیں حل کر دیا تھا مگر وہ جو انسانیت سے " لاتعلق " تھے حکمتِ قرآن کو سمجھ نہ سکے اور " لاانسانیت " کو اپنی خود ایجاد مذہبیت کا بنیادی عنصر بنا کر مطمئن ہو گئے ایسے میں نفاذِ شریعت کا شگوفہ اگر طرفہ تماشہ نہیں ہے تو اندیشہ ہے کہ چند آشفتہ سر " لاانسان " ہر مسلم کے ایمان اور اسلام کے نمونے سیل کر کے تحلیل کے لئے شرعی لیبارٹری میں بھیجنا شروع کر دیں اور وہاں سے نتائج برآمد ہونا شروع ہوں کہ اس ملک کا کوئی بھی مسلم ایمان کے تقاضے پورے نہ کرنے کی وجہ سے " اقلیت " ہے وہ جزیہ بھی ادا کرے اور نوکریوں سے بھی دست بردار رہو!

باب چہارم

مُرتدوں کو عبادت کرنے سے روکنا

جب کسی گروہ یا جماعت کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو اسلام کی رو سے اس کے تمام شہری اور مذہبی حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں اور اکثریتی حکمران طبقے کا فرض بن جاتا ہے کہ اپنے اقلیتی فرقوں کے جان و مال اور مذہب کی حفاظت اور آزادی کا خیال رکھے اور کسی خارجی اشتعال سے متاثر ہو کر اپنے پُرامن شہریوں کو نشانۂ انتقام نہ بنائے۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ۱۹۸۶ء کے ابتدائی مہینوں میں سندھ کے جیکب آباد اور سکھر اور سرائیکی علاقے کے رحیم یار خاں میں غیر مسلم اقلیتوں کو جانی و مالی نقصان بھی پہنچایا گیا اور عبادت گاہیں بھی نذرِ آتش یا نقصان سے دوچار کر دی گئیں بلکہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات میں یہ اندوہناک خبر بھی چھپ چکی ہے کہ روہڑی میں ایک ایسے پرانے مندر کو نذرِ آتش کر دیا گیا جس میں دو سو سال کے قدیمی اور بیش بہا نوادرات رکھے ہوئے تھے (۱)۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان یا دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کچھ خلافِ معمول سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے جواب میں یہاں کے ہندوؤں کو پریشان کرنے کا اخلاقی اور قانونی

---

(۱) بیت المقدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد ایک آسٹریلوی یہودی نے مسجد اقصیٰ کے جنوبی حصے یعنی مسجد عمر کو آگ لگا دی تھی جس میں دیگر نوادرات کے ساتھ ساگوان کی لکڑی کا خوبصورت اور بیش بہا منبر بھی جل گیا تھا جس کا دنیا بھر کے مسلمانوں نے بُرا منایا اور یہودیوں و امریکیوں کے خلاف مظاہرے کئے۔ پس اگر ہم اپنے نوادرات اور مقدسات کے نقصان پر افسوس کرتے ہیں تو ہمیں کسی دوسرے کو نقصان پہنچا کر خوش نہ ہونا چاہیے۔

جواز کیا ہے ؟ کسی بین الملکی معاملہ کو نمٹانے کا عامۃ الناس یا گروہ علماء کو کیا حق پہنچتا ہے ؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر جو انارکی روا رکھی جاتی ہے شرع اور اسلام نے کب اس کی اجازت دی ہے ؟ پھر یہ دراز دستی نہ صرف ہندوؤں اور مسیحیوں کے ساتھ روا رکھی گئی۔ اسماعیلی جو کہ قدیم ہی سے ایک مسلمہ فرقہ چلا آتا ہے ان تک بھی اپنوں ہی کے ہاتھ پہنچنے لگے ہیں کہ انہیں بھی جماعت خانوں میں (ڈنڈے کے زور سے) اذان وغیرہ سے روکا جا رہا ہے اور روکنے والے ان کے اپنے ہی بھائی بند ہیں یعنے دو افراد علی اکبر اور حاجی سکندر علی نے عدالتِ عالیہ میں مقدمہ دائر کیا ہے۔

> جس میں استدعا کی گئی ہے کہ انہیں اور ان جیسے ہزاروں آغاخانی مسلمانوں کو جماعت خانوں میں اذان دینے، نماز اور دیگر عبادات کی ادائیگی سے روکنے کے خلاف مستقل حکم امتناعی جاری کیا جائے

(بحذف تفصیل روزنامہ "امروز" ملتان ۲۳ ش/۸۶ نیز "جسارت" کراچی ۲۲ ش/۸۶)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمدیوں کی طرح اسماعیلیوں کو بھی اسلامی طریقے پر عبادت کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ یہ روکنے والے کون تھے اس کی ٹوہ لگانا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے ہم تو یہی جانتے ہیں کہ ——— کوئی بھی فرقہ نیا ہو خواہ پرانا۔ اس کے وجود کو اگر تسلیم کر لیا گیا ہے تو حکومت کی طرح۔ افراد کو بھی۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ اجازت نہیں ہے کہ اکثریت اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے اقلیتوں کو ذہنی یا جسمانی اذیت سے دوچار کر دے! کیونکہ

انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد

اللہ سبحانہ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ ——— فلاں فرقے کو تو میرا نام استعمال کرنے کی اجازت ہے اور فلاں کو نہیں ———

پس جب زبانِ وحی سے اس طرح کی پابندی کا سراغ نہیں ملتا تو "جنت" کے کسی اجارہ دار کو کیا حق پہنچتا ہے یا کسی ہائی اتھارٹی کو ـــــ اللہ کے نام کو استعمال کرنے سے روکنے کی اتھارٹی کیسے ہے کہ وہ ـــــ ذاتِ خداوندی اور عالمی شعور سے نبرد آزما ہو؟ جب کہ اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون ٥

" میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ صرف میری ہی عبادت کریں " ـــــ (ذاریات، ۵۶)

یہاں حرفِ " الّا " کو حصر کے مقام پر استعمال کر کے زور دے کے واضح فرمایا ہے کہ نوعِ بشر (مسلم ہو خواہ غیر مسلم) کو پیدا کرنے کا صرف ایک ہی مقصد اور صرف ایک ہی "غایت" ہے کہ وہ میری عبادت بجالائیں اور میرا نام استعمال کریں۔

بات کیا ہوئی کہ۔ اللہ غیر جانب دار ہے اس کا نام لینے کا ہر فردِ بشر کو یکساں حق حاصل ہے ـــــ اب جو شخص اللہ کے نام کے استعمال سے قہراً، جبراً اور قانوناً روکتا ہے تو اس نے گویا اللہ کے فلسفۂ تخلیق کو جھٹلایا اور بلاوجہ اللہ کے نام کو بلند کرنے میں رکاوٹ بن کر۔ (بقرہ، ۱۱۴) کی رو سے ظالم ترین لوگوں کے زمرے میں شامل ہوا۔ اور فقۂ حنفی کی رو سے نہیں چاہیئے کہ بے بصر دیدہ وروں کی بات مانی جائے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ مجتہدِ مطلق تھے آپ کا تعلق دبستانِ مرجیہ سے تھا۔ جن کے عقائد میں یہ بھی شامل تھا کہ ـــــ انبیاء اگر نہ بھی تشریف لاتے تو بھی انسان پہ "توحید" واجب تھی ـــــ اور نجات بغیر رسولوں کے بھی ممکن تھی۔ (تفسیر المنار طبع مصر جلد ۱/ ۳۳۸/ ۱۵ تا ۲۱)[1]

(۱) امام ابوحنیفہ معتزلہ اور مرجیہ کی طرح۔ سنیوں کے عقائد کی امام ابوالحسن اشعری (۳۲۴ھ م)

اس طرح مسلمانوں کا ایک قدیم مدرسۂ فکر اور اس سے وابستہ ہمارے امامِ اعظم۔ اپنے عقائدی فلسفہ میں "رسالت" یا کسی طرح کی "مذہبی" نیشنلٹی کو جزوِ توحید قرار نہیں دیتے تھے۔ حضرت ابا بکر صدیقؓ، جناب عبدالمطلب (۵۷۹ھ) اور دیگر بہت سے لوگ اسلام سے پہلے بھی موحد تھے اور بغیر کسی رہنمائی کے "اللّٰہ" کا نام لیتے رہتے تھے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ۔ اللّٰہ کا نام لینا اصطلاحی مشرکوں کے لئے بھی ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی اللہ کا نام زبان سے بلند کرے یا متبرک نام کا سیفیٹر پیچ "آویزاں کرے۔ اللہ کی طرف سے کھلی اجازت ہے (مزید عنوان "ملتے جلتے طریق عبادت" میں ملاحظہ ہو۔

اللّٰہ کے نام کا استعمال

اسلام اور کفر انسان کی ذہنی استعداد کے مظہر ہیں اور قانونِ خداوندی کے مطابق

کے پیرو کار بھی۔ اللہ کو غیر جانب دار کہتے اور نجات کو کسی رسول سے مربوط نہیں کرتے تھے۔

علامہ رشید رضا مرحوم۔ لکھتے ہیں و ذهب كثير منهم (ای الاشاعرة) الى الاكتفا ببلوغ دعوة ای نبی فی رکنی الدین۔ الرکنین وهما الايمان بالله وباليوم الاخر فمن بلغته وجب عليه الايمان بهذين الاصلين وان لم يكن النبی مرسلا اليه

"بہت سے اشاعرہ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ دین کے دو بنیادی رکن یعنی "اللّٰہ" پہ ایمان اور یوم آخرت کی دعوت جب کسی بھی رسول کے ذریعہ پہنچے تو ایمان (دنجات) کے لئے کافی ہے۔ خواہ کوئی رسول بطورِ خاص اس کی طرف نہ ہی آیا ہو" (المنار جلد ۱/۳۴۸/۱۲ تا ۱۴)

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی مرتد۔ اگر موحد ہے تو اس پہ تلوار کا وار کارگر نہیں ہو سکتا۔ کہ توحید اصل الاصول ہے۔

ظہور میں آتے ہیں اور قانون یہ ہے کہ ـــــ انسان کو بُرے بھلے کی "تمیز" عطا کر کے صاحبِ "ارادہ" و "اختیار" بنایا گیا ہے۔ اب وہ سیدھی راہ چلتا ہے تو اپنے بھلے کے لئے اور اگر بھٹک جاتا ہے تو اس کا وبال اسی پہ عائد ہو گا (یونس، ۱۰۸) لیکن وہ مسلم ہے یا مشرک۔ اس پہ اللہ کا نام استعمال کرنے پر پابندی نہیں ہے۔ حضورِ نبیِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اہلِ شرک بھی "اللہ" کا نام استعمال کرتے تھے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو یہ کہہ کر۔ اللہ۔ کا نام لینے سے روکا ہو کہ۔ یہ اب اسلامی ثقافت کا مظہر ہے کوئی غیر مسلم اس کے استعمال کا مجاز نہیں ہے۔ سورۂ زخرف۔ میں فرمایا۔ ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله۔

"اور (اے پیغمبر) ان (مشرکین عرب) سے اگر دریافت کرو کہ انہیں کس نے پیدا کیا؟ تو پکار اٹھیں گے کہ۔ اللہ" (زخرف، ۸۷)

اور اسی ہی مضمون کو زخرف (۹) میں نیز دہرایا گیا ہے۔ اس طرح ان آیات کے ذریعہ اُن مشرکین کے وطیرے کی نشاندہی کر دی گئی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر اور اسلامی ریاست کے شہری تھے کہ وہ "اللہ" کا نام استعمال کرتے تھے لیکن نہ تو انہیں اللہ سبحانہ نے اپنا نام پکارنے سے منع فرمایا اور نہ ہی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی طرح کی سرزنش فرمائی ایسے میں اگر کوئی صاحب یہ فرما دیں کہ یہ اسم محترم۔ صرف اسلامی ثقافت کا مظہر ہے لہذا کوئی غیر مسلم اسے استعمال کرنے کا مجاز نہیں ہے تو یہ ایک گونہ ستم ظریفی تو ہو سکتی ہے دلیل و منطق کی بات نہیں کہلا سکتی۔ بلکہ گہرائی میں جائیے تو۔ وہ صاحب نہ صرف قرآن کی گواہی کو جھٹلانے کے مرتکب ہو جاتے ہیں اس

حقیقت کا اظہار بھی کر جاتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد۔ اسلامی ثقافت کا مظہر نہیں تھا۔ العیاذ باللہ۔

کسی ملنے جلتے طریق عبادت سے روکنا

:- اگر آپ چاہیں کہ اپنے سے ملتے جلتے طریق عبادت سے غیروں کو روک دیں تو ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر انسان جس کا پیروکار ہے اُسی کے تبلائے ہوئے راستے پر ہی چلنا چاہے گا۔ اب اس سے سوال نہیں کہ اس کا راہبر حق پرست ہے یا باطل کا پجاری؟ کیونکہ ایسا بھی ہوتا چلا آیا ہے کہ جو مستقل شریعتیں ساتھ لائے تھے ـــــــ انہیں بھی اپنے سے پیشروں کے طریق کار کو اپنانے کا حکم ملتا رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گروہ۔ کسی بڑی جماعت سے الگ راستہ بنا لیتا ہے یا کسی نئی فکر کو ساتھ لے کر چلتا ہے وہ اگر سابقہ جماعتوں کے طور طریقوں ہی کو اپنا طریق کار بنا لیتا ہے تو اُسے رد کیا نہیں جا سکتا کہ وحی الٰہی نے یہاں بھی کوئی پابندی عائد نہیں کر رکھی۔ ابراہیم، اسحاق، یعقوب، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام (انعام ۸۴ تا ۸۵) کے ذکر کے بعد فرمایا اولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده

"(اے پیغمبر!) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے راہِ حق دکھا دی پس تم بھی انہیں کی راہ کی پیروی کرو" ۹۰/۶ (ترجمان القرآن جلد ۱/ ۴۵۷)

یعنے مسیحی، یہودی اور دیگر تمام اقوام جو راہِ حق پہ چلنے والی ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ مستقل شریعت کے حامل ہوتے ہوئے بھی۔ اُن اقوام کے طریق کار کو اپنا لیں۔ رد کرنے والا کون ہوتا ہے؟ کیونکہ مقصد جب خدا پرستی ہے یا ظاہری طور پر حق پرستی ہی کو مقصود ٹھہرایا گیا ہے۔ تو اُسے اختیار کرنے

کی ہر فردِ بشر کو اجازت ہے کوئی یہ کہہ کر۔ طریقِ عبادت سے نہیں روک سکتا کہ فلاں طریق صرف ہماری ہی عبادات کا مظہر ہے لہذا اسے اختیار کرنے سے مغالطہ اور اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے ——؟ کیونکہ مغالطہ اور اشتباہ اگر —— طریقِ عبادات میں مماثلت سے روکنے کا موجب بن سکتے تو وحیِ الٰہی اس سے غافل نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس روکنے کے ہزاروں پیرائے موجود تھے

یہاں انعام (۹۰) میں "ھدایت" کا لفظ ہے جو صرف "اچھائی" سے تعبیر ہے اس طرح نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام کی "اچھائی" میں پیروی کا حکم ہے اور اصول کے بطور واضح فرمایا کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی "اچھائی" میں اگر کوئی نبی اکرمؐ اور انبیاء کے شیوے کو اپنا لیتا ہے تو یہ حکمِ خداوندی اور نفسیاتِ وحی کے عین مطابق ہے یعنے آج اگر مارٹن لوتھر (۱۵۴۶ء) حضرت گرو نانک (۱۴۶۹ء) اور سید محمد جونپوری (۱۵۰۹ء)[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) سید جونپوری کی دعاوی کی بابت شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۱۶۴۲ء) لکھتے ہیں

در اعتقاد سید جونپوری۔ ہر کمالے کہ محمد رسول اللہ صلعم داشت و سید سید محمد را نیز بود فرق ہمین است کہ آنجا باصالۃ بود اینجا بہ تبعیۃ۔ و بہ تبعیۃ بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد

(بحوالہ "تذکرہ" مولانا آزاد مرحوم طبع کلکتہ ۱۹۱۹ء صفحہ ۳۰ سطر ۱۲ تا آخر)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ

سید محمد جونپوری کا عقیدہ تھا کہ جو کمالات حضرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھے اُسے بھی حاصل ہیں فرق یہ تھا کہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم منبع فیض سے براہِ راست مستفیض تھے اور وہ بواسطہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر فائز ہو کر آپ کے ہمہ کمالات میں آپ ہی کی طرح بن گئے ہیں۔

راقم الحروف کے نزدیک نبوت کسی بھی نوعیت کی ہو ختم ہو چکی ہے۔ اسے اگر لا محالہ جاری ہی رکھنا ہے تو بخاری و دیگر کتب احادیث کی روشنی میں مستقل طور پر جاری رکھیے۔ بصورت دیگر "ختم" کا مفہوم نامعلوم ہو کر رہ جائے گا اور قرآن نے جو بات بغیر کسی ذہنی تحفظ واضح فرما دی تھی وہ کم از کم فقہاء و محدثین کے نقطۂ نظر سے مبہم اور مجہول ہو جاتی ہے العیاذ باللہ۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ۔ اجزائے نبوت کی یہ اصطلاح لوگوں کی افتادِ طبع کی ٹوٹی پھوٹی پہچان تو مہیا کرتی ہے لیکن یہ معیار کسی بھی پہلو سے حتمی نہیں ہے اور عموماً اصطلاحات افراد اور جماعتوں کو سمجھنے اور ان کے درست مقام کو متعین کرنے میں الجھنیں پیدا کرتی ہیں اور ذی حس لوگ الجھنوں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ مسلمانوں نے اگر احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں نبوت کو لا محالہ جاری رکھنا ہی ہے تو جرأت و جسارت کے ساتھ جاری رکھیں

باقی اگلے صفحے پر

کے پیش کردہ تصورِ توحید یا دیگر اچھائیوں کو اپنا لیتے ہیں تو ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ عقیدے یا عبادت میں اشتباہ اور مغالطہ کے بہانے کسی پہ پابندی عائد کر دیں؟ یا اِن کو اللہ کے نام کے استعمال سے روک دیں؟

منافقت کے راستے اسلامیات کو اپنا لینا

کہا جاتا ہے کہ منافق اور مرتد کی سچی گواہی بھی جھوٹی متصور ہوگی وہ اگر زبان سے کلمہ توحید پڑھ بھی لیتا ہے تو جان کی امان پانے کے لئے پڑھتا ہے۔

جی نہیں۔ یہ فیصلہ آپ نہیں کر سکتے۔ اللہ جو کہ سینوں کا بھید جاننے والے ہیں وہی بتلا سکتے ہیں کہ جسے منافق یا مرتد کہا گیا ہے۔ وہ حقیقت میں کیا ہے؟ اور اللہ کا بتلانا پیغمبروں سے خاص ہے ہر انسان منصب پیغمبری پہ فائز نہیں ہو سکتا یوں بھی کسی کے نفاق کا سراغ لگانا کٹھن مرحلہ ہے البتہ فتوے کی خوردبینی نظروں پہ ہو تو کسی کے باطن کا حال معلوم کئے بغیر بھی مرتد ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن کچھ ضروری نہیں کہ

پھر قرآن کے ناطے سے بات کرنا چھوڑ دیں۔ سید جونپوری اگر "مانند" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن کر بھی گوارا ہیں تو۔ یہی حق اُن لوگوں کو بھی ملنا چاہیئے جو۔ اسی معیار کے مطابق "مانند" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بننے کے عزائم رکھتے ہیں پھر تو وہ بھی گوارا ہونے چاہئیں۔ بات کیا ہوئی کہ نبوت کا دروازہ تو بند ہے لیکن روشندان اور کھڑکیاں کھلی رہیں گی۔

ساقم الحروف کے نزدیک سید جونپوری چونکہ اپنے دعاوی کے بموجب "مانند" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے العیاذ باللہ لہٰذا اُسے نرم سے نرم لہجہ میں مارٹن لوتھر یا۔ بابا گرو نانک کی سطح کا ایک مصلح سمجھنے کی گنجائش رکھتا ہے لہٰذا اسی ہی سطح کا انسان سمجھ کر زمرۂ مصلحین میں شمار کر سکتا ہے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں یعنی محدث دہلوی کی تصریح کے مطابق جونپوری نے اگر اپنا راستہ متعین کرنے کے بعد کسی امر میں اتباعِ (تبعیت) محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شیوہ بنا لیا ہے تو اسے روک دینے کا جواز نہیں ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کمالات میں مانند (ہیچو) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے لوگ تو ہو سکتے ہیں مگر نبی کی ذاتی صحبت میں رہنے والے ابوبکر، عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم۔ جن کا لوحِ قلب صیقل و مصفیٰ ہو چکا تھا وہ "ہیچو" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بن سکے یا للعجب!

کاش یہ لوگ قرآن پاک کو ہدایت کے لئے کافی سمجھتے اور نبوت کے نازک تقاضوں کا احساس کرتے تو نہ مہدی و مسیح کی ملفِ گرہ گیر کے اسیر بنتے اور نہ ہی تجدد و اصلاح کے لئے نئی اصطلاحات کی اختراع و ایجاد کرتے۔

"موت سے پہلے کسی کے ارتداد پر مہرِ تصدیق ثبت کی جائے۔ یہاں بھی معاملہ اللہ کے علم سے وابستہ ہو جاتا ہے کہ مرنے والا زندگی کے آخری سانس میں کیا فیصلہ کر کے "مرا" ہے؟ اس حقیقت کی ضَو میں منافق کی ہر گواہی جھوٹ نہیں ہو سکتی۔ یہ گواہی کی نوعیت پر منحصر ہے مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ ماں، بہن اور بیٹی سے نکاح حرام ہے۔ اب یہ کہنے والا کتنا ہی منافق تصور کر لیا جائے جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک رواجی مؤمن سے جب دریافت کرو تو وہ بھی اِن رشتوں کو حرام ہی قرار دے گا تاہم منافق کے دِل اور باطن کے کردار کو اگر ماحول اور شخصیات سے مربوط کیا جائے یعنی ایک شخص کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ "زید" سے نفرت کرتا ہے یا اپنے گرد و پیش کے ماحول سے متنفر ہے مگر جب زید سے ملتا ہے تو اس کی تعریفیں کرنے لگتا ہے اور گرد و پیش سے جب عملی رابطہ پیدا کرتا ہے تو مصالحانہ اور دوستانہ رویہ اختیار کرتا ہے تو ایسے "نفاق" کو بھی شرعی نفاق نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ اللہ نے زید کو شخص مذکور کے منافقانہ کردار کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی اپنے طور پر کوئی انسان خواہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو منافق کی پہچان رکھ سکتا ہے لہٰذا دنیا کا کوئی بھی انسان کسی کے نفاق کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ طیش اور غصے میں عقائد و نظریات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ بات کیا ہوئی کہ جسے نفاق سے موسوم کیا جاتا ہے وہ اصطلاحی نفاق نہیں ہے اِسے "**تقیہ**" سے موسوم کیا جا سکتا ہے مثلاً۔ ہمارے ملتان کے اکثر زمیندار اپنے نقطۂ نظر سے راسخ العقیدہ ہیں مگر "عشر" سے بچنے کے لئے اکثر نے "سنی سرکار" کو اپنے "شیعہ" ہونے کی اطلاع دے کر "عشر" کی زحمت سے نجات پالی ہے۔ اسی طرح اہل حدیثوں و دیگر موحد حضرات نے اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو انہیں محسوس ہوا کہ۔ قومی اتحاد۔ میں اکثریت رضاخانی سنیوں کی ہے اور یہ لوگ جب بھٹو مرحوم (1978ء) کے خلاف جلوس ترتیب دے

لیتے ہیں تو۔ شرکائے جلوس کی حرارتِ ایمانی کو بڑھانے کے لئے نعرہ رسالت اور نعرۂ حیدری لگانا ضروری سمجھتے ہیں۔ تو اِن لوگوں نے بھی سیاسی و قومی یگانگت — یا "رواداری" کی ہم آہنگی دکھلانے کی خاطر۔ یا رسول اللہ۔ اور۔ یا علی کی ضربیں لگائیں حالانکہ اِن کا دل مطمئن نہیں تھا مگر مصلحتاً شرکت بھی ذریعۂ اتحاد تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اب ہم ان میں سے کسی بھی فرد کو اصطلاحی منافق نہیں کہہ سکتے یا یہ کہ عہدِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقوں کی طرح کا منافق نہیں کہہ سکتے کہ آج ہمارے درمیان نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں نہ وحی کی اطلاع کا متبادل ذریعہ! لہٰذا کسی کے عمل کو ناگزیر حد تک اگر نشانہ بنانا ہی ہے تو اس کے ظاہر و باطن میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے "تقیہ" کا نام دے سکتے ہیں اور تقیہ "رخصت" کا پرتو ہے یعنے انسان اگر اپنے میں لچک پیدا نہیں کر سکتا اور اپنے مافی الضمیر کا برملا اظہار کر کے مخالف ماحول میں خطرہ مول لیتا ہے تو یہ "عزیمت" ہے لیکن اگر وہ عزیمت کی راہ نہیں چلتا لاٹھی بھی بچاتا اور سانپ بھی مارنا چاہتا ہے تو یہ "رخصت" ہے اِسے تقیہ کے عنوان سے واضح کیا گیا ہے امام بخاری (۲۵۶ھ م) حضرت عائشہ صدیقہؓ (۵۸ھ م) سے روایت کرتے ہیں

"ایک شخص نے دربارِ نبویؐ میں حاضر ہونے کی استدعا کی آپؐ نے اس کا نام سن کر اندر آنے سے پہلے فرمایا۔ بئس ابن العشیرہ (قوم کا بدترین فرد آ دھمکا ہے) اس کے بعد آپؐ نے اسے اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور کچھ دیر بعد جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ (علیک السلام) پہلے تو "ملاقاتی" کے حق میں آپؐ نے سخت الفاظ کہے (قلتَ ما قلتَ) پھر دفعتاً نرمی کا برتاؤ فرما گئے (ثم اَلَنْتَ لہ بالقول) یہ کیا ماجرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا۔ یا عائشہ

ان من اشر الناس من یترکہ الناس.........

اتقاء فحشہ؟

لوگوں میں بدترین قسم کا وہ انسان ہے جس سے سوسائٹی کا ہر فرد غیر محفوظ ہو اور اس کے شر سے بچنے کے لئے تقیہ کی پالیسی اپناتا ہو۔ (بخاری)

بخاری ہی میں ابو درداء صحابی (۳۵۲ھ م) سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا۔ انا لنکشر فی وجوہ قوم ان قلوبنا لتلعنہم

"ہم ان لوگوں کا سامنا کرنے پر خندہ پیشانی اور متبسم ہونٹوں سے مل تو لیتے ہیں مگر ہمارے دل ان پر نفرین ولعنت کر رہے ہوتے ہیں"

(بخاری بحوالہ ابن کثیر طبع مصر جلد ۱/ ۳۵۷)

یہ احادیث واضح کرتی ہیں کہ۔ ماحول کی مناسبت سے پالیسی اختیار کرنا "منافقت" نہیں ہے اور غالباً امام شافعی (۸۲۰ھ م) نے ان ہی احادیث سے اشارہ پا کر فرمایا ہے کہ

"جس طرح اعدائے اسلام کی اذیت رسانی سے بچنا (تقیہ کرنا) لازمی ہے اسی طرح شر پسند مسلمانوں کے سامنے "تقیہ" کو شیوہ بنانا بھی ضروری ہے"

(تفاصیل ملاحظہ ہوں۔ تفسیر "منسوخ القرآن" ص۲۷۶ تا ص۲۸۱)

یہ شواہد بتلا رہے ہیں کہ۔ اگر کوئی شخص زبان سے کلمہ توحید کا اظہار کرتا ہے تو نظر بہ ظاہر۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ منافق ہے؟[1] ڈر کے مارے اللہ کا نام لے رہا ہے؟ اس کا دل خائن ہے؟ وغیرہ وغیرہ کیونکہ باطن کا علم صرف اللہ کو ہے اس کے باطن کے جھروکوں میں جھانکنا وحیِ الٰہی کی تصریحات کے منافی ہے اور قرآن اس

(۱) اصطلاحی منافق

طرح کے منفی رجحان کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا ــــــ بات کیا ہوئی کہ اللہ کا نام لینے والا مرتد ہو خواہ منافق انہیں کسی بھی حیلے بہانے۔ اذیت اور "ممانعت" سے دوچار نہیں کیا جا سکتا یہ انتہائی غلط سوچ ہے کہ۔ ہم اپنے جی سے لوگوں کے اظہارِ توحید پہ پابندی عائد کرتے چلے جائیں۔ ہمیں کسی کی نیت پہ شبہ کرنے کی نہ اجازت ہے اور نہ ہی چھیڑنے کی ضرورت۔ اگر فتوے کی رو سے کوئی "منافق" ہے تو بلا سے۔ ہم اس کے ظاہر پہ اعتماد کرنے کے مکلف ہیں۔ نفاق کا وبال اسی پہ عائد ہوگا ــــــ ہم یہ نہیں ہمیں قرآن "دینی حریت" کا درس دیتا اور آزادیٔ ضمیر کا احترام سکھاتا ہے وہ عقیدے کی اساس پہ شہری اور مذہبی حقوق پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا اگر کسی کا عقیدہ صحیح ہے تو اس کا فائدہ عیاں ہے اور اگر کوئی فاسد العقیدہ ہے تو بھی وبال اور سزا اللہ کی جناب سے ملے گی۔ ہم مجاز نہیں ہو سکتے۔

حالتِ جنگ ہو تب بھی اجازت ہے کہ مُشرکین "اللہ" کا نام استعمال کریں

سورہ توبہ
مدنی سورہ

ہے جس میں زیادہ تر جنگِ دفاع کے احکام ہیں اس میں فرمایا کہ

وان احد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم ابلغه مأمنه

"اور (اے پیغمبر) اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے پناہ مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سن لے پھر اسے (بہ امن) اس کے ٹھکانے پہنچا دو"

(توبہ ۶ ترجمان القرآن جلد ۲/۷۵)

یہاں اُس غرض کا احساس دلایا ہے کہ قرآن سننے کے مقصد کے پیشِ نظر

میدان جنگ سے اگر کوئی مشرک اِدھر پہنچ جائے تو اُسے مایوس نہ کرنا چاہیئے کہ اُسے قرآن سننے کا کوئی حق نہیں ہے؟ ــــــ اور ظاہر ہے کہ قرآن پاک سننے اور پڑھنے کی صورت میں " اللہ " کا نام بار بار زبان پہ آتا ہوگا جس سے واضح ہوتا ہے کہ جنگ جیسے حساس اور پُرخطر موقعہ پہ جب کہ اللہ ۔ کا نام استعمال کرنے سے دھوکا بھی لگ سکتا ہے ۔ ارشاد ہوا کہ ۔ بے خطر ہو کر استعمال کی اجازت ہے بلکہ بعد میں اگر وہ چاہے کہ اپنوں میں لوٹ جائے تو آپؐ کی ذمہ واری ہے کہ اُسے بحفاظت پہنچا دیں تاکہ ان کی جگہ پہ پہنچ کر آزادی و اختیار کے ساتھ غور و فکر کرے اور جو راہ چاہے اختیار کر لے ۔

" اس سے معلوم ہوگیا کہ دین کے بارے میں تقلید کافی نہیں فہم و اذعان ضروری ہے ورنہ قرآن کا سنانا اور پھر غور و فکر کی مہلت دینا ضروری نہ ہوتا ۔ یاد رہے قرآن جس طرح اس معاملہ میں جبر کی پرچھائیں بھی دیکھنا نہیں چاہتا اسی طرح تقلیدی اعتقاد کا بھی روادار نہیں "

(ترجمان القرآن ۲/ ۷۷/ فٹ نوٹ ۲)

ہر عبادت گاہ میں " اللہ " کا نام استعمال ہو سکتا ہے

سورۂ حج مدنی سورتوں میں سے اہم سورہ ہے

اس میں حج و عمرہ کے احکام کے پہلو بہ پہلو قتال اور جنگِ دفاع کے احکام بھی بیان ہوئے ہیں اسی ضمن میں فرمایا ۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوٰت ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا

" اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا رہتا (اور) ایک گروہ کو دوسرے گروہ پہ ظلم و تشدد کرنے کے لئے بے روک

چھوڑ دیتا) تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی۔ خانقاہیں اور
گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا
ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے"

(ج۲م۔ ترجمان القرآن ۲/ ۵۱۱ بتعاون ڈپٹی نذیر احمد مرحوم طبع تاج کمپنی ص۴۰۶)

یہاں مشرقِ وسطیٰ کی اُن غیر مسلم عبادت گاہوں کا ذکر ہے جو مسجد سے مختلف تشخص رکھتی تھیں۔ اِن میں "صوامع" کا ذکر ہے جو لطائف اللغۃ۔ کی تحقیق کے مطابق ہر مذہب کی عبادت کی کوٹھریوں کو کہا جاتا ہے (لغات القرآن جلد۳/ ۱۰۴۹)
دوسرا لفظ "بِیَعٌ" کا ہے جو مسیحیوں کے کلیسا (CHURCH) کو کہا جاتا ہے
اور اس کا تیسرا لفظ "صلوات" ہے جو فرید وجدی (۱۹۵۴م) کے بقول یہودیوں کی عبادت گاہ (SYNAGOGUE) کے مفہوم میں آیا ہے (۱)

یہ تمام الفاظ از اول تا آخر۔ حرفِ عطف کے ذریعے ایک ہی غرض کو واضح کرنے آئے ہیں کہ۔ اِن عبادت گاہوں میں اللہ ہی کا نام استعمال کیا جاتا ہے یہاں یذکر فیھا میں، فیھا، کا ضمیر ضابطے کی رو سے اگرچہ قریب کے لئے ہونا چاہیئے مگر عطف کے رابطے نے اسے پورے سلسلے کی عبادت گاہوں کو مرجع بنا دیا ہے۔ یعنی۔ یذکر فیھا اسم اللہ۔ کا مرجع جس طرح مسجد ہے عطف کے ذریعہ، صلوات، صوامع اور بیع بھی ہے اس طرح اگر مساجد میں اللہ کا نام لیا جا سکتا ہے تو اشارۂ وحی کے بموجب۔ گرجوں، ٹمپلز۔ عبادت کے مخصوص حجروں اور دیگر غیر مسلم عبادت گاہوں میں بھی اللہ۔ کا نام پکارا جا سکتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے ۔ قرآن کی ذاتی وضاحت ہے اور غیر مسلموں کو اپنی اپنی عبادت گاہوں میں اللہ کا نام لینے کا اذنِ عام ہے۔ اب دنیا کی کوئی ایسی طاقت نہیں جو اللہ کے اذن کو اپنے

(۱) المصحف المفسر طبع قاہرہ ص۴۴۵

جہلِ مرکب سے مسترد یا منسوخ کر دے!

ضابطۂ "نہی" کا تقاضا

قرآن پاک میں "امر" اور "نہی" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور تعرف الاشیاء باضدادھا۔ کے مطابق۔ ہر نہی کی پہچان امر سے مربوط ہے اور ہر۔ امر کا وجود نہی کے تقاضوں کو شامل ہے۔ اس طرح تمام "اوامر" اپنی ضدیں "نواھی" کو اور ــــ تمام "نواھی" اپنے مفہوم میں "اوامر" کو مستلزم ہیں۔ یہ گرامر کا مسلمہ اصول ہے۔ مثلاً۔ آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "جھوٹ مت بول" ــــ تو یہ "مت بول" اپنے اندر ایک ضد کا متقاضی ہے جو امر کے روپ میں اس کے "اندر" موجود ہے یعنے "سچ بول" اور اس کے برعکس۔

اس ضابطہ کی رو سے جب آپ کسی سے کہیں گے کہ ــــ اللہ کا نام مت لو ــــ تو یہ نہی اپنے اندر ضد کے حکم کو مستلزم ہوگی ــــ اور اللہ کے نام سے روک دینے کے معنےٰ ہوں گے "غیر اللہ کا نام لو" اور ظاہر ہے کہ اس طرح نہ صرف توحید باری کے حساس تقاضے مجروح ہوں گے شرک کا حکم دینے پر اللہ کی نافرمانی بھی لازم آئے گی جب کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا طاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔

"جس حکم (آرڈیننس) سے اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو اس کو ماننا ضروری نہیں ہے" (کتب احادیث)

یہاں "مخلوقٍ" کا لفظ نکرے کے مقام پر آکر "عموم" کی نشاندہی کر گیا ہے یعنے۔ منشاءِ خداوندی کے خلاف حکم دینے والی کوئی سی اتھارٹی ہو مذہبی قیادت ہو، ریاستی جبر ہو۔ یا کوئی سی پیر سیادت ہو اس کی اطاعت لازم نہیں آتی۔ وہ حکم ہی (لاطاعۃ) کالعدم متصور ہوگا۔ لیکن جہاں نظام حکومت دینی ہو ـ

تھیا کہ یسی گرفت زدروں پر ہو دہاں۔ لا طاعۃ ۔ کے تقاضے بدل جائیں گے اور جان کی امان پانے کے لئے قانون کی پابندی لازمی ٹھہرے گی۔ قانون نافذ کرنے والا اگر کسی غلط حکم کی پابندی کرانا چاہتا ہے تو اس کا وبال اسی پر ہی عائد ہوگا۔ پابندی کرنے والا کسی طرح کے روحانی عذاب کا مستوجب نہ ہوگا مزید وضاحت اگلے عنوان میں آرہی ہے۔

قانونِ امتناع سے بے خبری

کہا جاتا ہے کہ "اللہ" کا نام ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ غیر مسلموں کے لئے ناقابلِ استعمال قرار دیا گیا ہے۔

جی ہاں قانون غلط ہو یا صحیح اس کا احترام واجب ہے[1] کیونکہ ہم خلفائے راشدین کے دور کی مخلوق نہیں ہیں کہ جب کسی بات میں اطمینان نہ ہو تو وقت کے خلیفہ سے بازپرس کر کے تسلی کر لیں۔ تاہم روزمرہ کا ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہاں کسی بھی شرعی معاملہ میں اگر کوئی ماتحت عدالت فیصلہ کرتی ہے تو شرع کے نقطے ہی سے کرتی ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ عدالتِ عالیہ اسے مسترد یا معطل کر دیتی ہے مثلاً۔ ملتان کی ایک عدالت نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی مگر نظرِ ثانی پر عدالت

(۱) جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ خود بھی قول و فعل کے تضاد کا شکار ہیں۔ روایت بیان کی ہم سے MKY بھٹی نے۔ کہا خبر دی ہم کو MA مجوکہ نے کہ روایت سنائی مجھے ایک با اعتماد اور ثقہ راوی نے کہ۔ جب مرحوم سر ظفر اللہ تھے عالم بے ہوشی میں۔ تو گیا اُن کے پاس ملک کا بڑا آدمی واسطے تیمار داری کے ۔ پس دیکھا اور سینے کے ظفر اللہ کے لکھا ہوا کلمہ طیبہ۔ اور پھر دیکھا اور بیٹے کے اس کے سینے پر آویزاں لوحِ کلمہ کا۔ مگر نہ تو اس نے اعتراض کیا ان ہر دو پر۔ نہ عیادت چھوڑی ظفر اللہ کی ۔ اور نہ ہی ڈھکوایا ان کو بیچ میں جیل کے۔ پس کیا فرماتے ہیں انصاف والے کہ یہی بڑا آدمی ظفر اللہ کو تو کچھ نہیں کہتا مگر روکتا ہے دیگر احمدیوں کو اعلانِ توحید سے۔ اور ڈھکواتا ہے ان کو بیچ میں جیل کے ؟ —

عالیہ نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا۔ اسی طرح کوئٹہ کی ایک عدالت نے صدارتی آرڈیننس کے حوالہ سے کلمہ طیبہ کے استعمال پر ایک احمدی کو دو سال قید بامشقت کی سزا دی مگر عدالتِ عالیہ نے اس فیصلہ کو معطل کر دیا۔ اس طرح ہر دو عدالتوں کے فیصلے لامحالہ شریعت کی ضَو ہی میں صادر ہوئے ہوں گے۔ اب ہم اگرچہ ہر فیصلہ کا احترام کرنے کے پابند ہوں گے مگر شریعت کی بابت ذہن میں جو تشویش لاحق ہو جاتی ہے اس کا علاج کیا ہے؟ پھر عدالتوں کے اِن اختلافی فیصلوں سے شریعت کی بابت جو رُسواکن مکروہ تصور ابھرتا ہے اس کی تلافی کیسے ہو گی؟——

یہ درست ہے کہ ہم پاکستان کے اقانیم خمسہ۔ عدلیہ، فوج، نظریہ پاکستان، قائدِ اعظم اور ملا ازم پر تنقید نہیں کر سکتے کہ یہ سب تنقید سے بالاتر اور معصوم ہیں۔ لیکن یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اخبارات پڑھ کر ہمارے پژمردہ حوصلے میں تھوڑی سی رمق آجاتی ہے کہ عدالتوں کے رویہ کی بابت قومی اسمبلی میں زبردست تنقید کی جاتی ہے۔ اور اس تنقید کو توہینِ عدالت کے دائرے میں نہ تو کھینچ لایا جاتا ہے اور نہ ہی ممبران کے نام عدالتوں کی وارننگ موصول ہوتی ہے۔ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ عدالتیں دیدہ و دانستہ قاتلوں کو بری اور بے قصوروں کو سزائے موت سناتی اور۔ رشوت اور سفارش کے ذریعہ انسانی جانوں کو نذرِ دار ٹھہراتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

الحاصل عدالتوں کا احترام ہم پر واجب ہے ہم قانونی اغلاط غلطیت ان کے منہ آنا مناسب نہیں سمجھتے۔ صرف "گرامر" ادب اور اصول فقہ کے دائرہ سے بات کرنا چاہیں گے۔ کیونکہ گرامر کے قوانین اور ضابطے نہایت جزرسی، تحقیق اور استقرار سے مدوّن ہوئے ہیں اور اصولاً یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ اِن کی اساس قرآنِ محکم کے استعمالات، شریف کلمات اور شعر عربی پہ

رکھی گئی ہے لہذا سوچنا یہ ہوگا کہ "کلمہ طیبہ" یا "اللہ" کے متبرک اسم کے استعمال کی بابت حکم امتناعی صادر کرنے والے گرامر کے اِن قوانین وضوابط کے کس قدر شناور اور قواعدِ فقہ سے کس حد تک آگاہ تھے کیونکہ اصولِ فقہ کی رو سے حکم امتناعی کے صیغوں کو ہمیشہ "ناپسندیدہ" امور سے روکنے کے لئے خاص کیا گیا ہے اور اس "قاعدے" کا ماخذ قرآنِ پاک ہی ہے جس کی اصطلاح میں اسے "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کہا جاتا ہے۔ "امر" اچھائی کو فروغ دینے یا حکم کے ذریعہ نافذ کرنے کے لئے ہے اور "نہی" (حکم امتناعی) برائی سے روکنے یا حکم امتناعی کے ذریعہ باز رکھنے کے لئے۔ یعنی کہ "اچھائی" امر کا لازمی وصف ہے اور "برائی" نہی کا ضروری پہلو! یا یہ کہ حکم صرف اچھائی کا دیا جاسکتا ہے اور روکا صرف برائی سے جاتا ہے

قرآن، فقہ اور گرامر کے اس ضابطے کی رو سے "کلمہ طیبہ" کے استعمال سے روکنا جہاں نفسیاتِ نہی کے خلاف ہے وہاں کلمہ کو "برائی" سے مشابہ قرار دے کر اسلام کی بنیاد پر تیشہ چلانا بھی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ جو چیز بری نہیں ہے اُسے "بُرائی" ٹھہرانے کے بعد ہی نہی کا اطلاق صحیح ہو سکتا ہے (۱)

کلمہ شعائر اللہ مگر کس معنے میں؟

کہا جاتا ہے کہ "کلمہ" طیبہ شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی بجا آوری کسی بھی غیر مسلم کے لئے ممنوع قرار دی جاسکتی ہے وغیرہ

ہمارے نزدیک "کلمہ" اگر نیکی ہے تو اسلام۔ بلا تفریق ہر انسان کو نیکی

---

(۱) یہ یاد رہے کہ اسلامی عہد میں جہاں فقہِ حنفی کا رواج بھی ملتا ہے غیر مسلموں نے کلمہ طیبہ کو نہ صرف وردِ زبان بنایا ہے اپنی تعلیمات اور عقیدۂ توحید کا جزو بھی ٹھہرایا ہے حضرت بابا نانک (۱۴۶۹ء) علیہ الرحمۃ کی گرنتھ مقدس اس کا زندہ ثبوت ہے۔

اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور اگر شعائر اللہ میں سے ہے تو بھی حکم یہی ہے کہ۔ لا تحلوا شعائر اللہ

"شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو" (مائدہ ۵، ۲)

اور بے حرمتی یہ ہے کہ لوگوں کو شعائر اللہ اختیار کرنے یعنے اللہ کا نام لینے سے روک دیا جائے جب کہ واضح تعلیم ہے کہ ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب

"جو اللہ کے شعائر کی عظمت قائم کرتا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ اس کے صفائی قلب کی علامت ہے (حج ۳۲)

یہاں ظاہر ہیں اگرچہ حج کے احکامات کو شعائر اللہ۔ سے موسوم کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں جس چیز پہ اس فقرے کا اطلاق ہوتا ہے اس کی اہمیت کا صرف احساس دلایا گیا ہے مثلاً ایک مملکت کے کچھ شعائر یعنے علامات (یا - SYMBOLS) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنے یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ مثلاً کسی مملکت کا جھنڈا ــــــ جھنڈا ویسے تو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی! جھنڈے کے احترام کے معنے یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ انہی علامات کو شعائر کہا جاتا ہے لہذا شعائر اللہ سے مراد اس مملکت کی "محسوس" علامات ہوں گے جو قوانین خداوندی کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہو۔ ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔ ان شعائر کی پرستش نہیں کی جائے گی صرف ان کا احترام کیا جائے گا کیونکہ یہ شعائر فی ذاتہ۔ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کا احترام قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے اور بس (۱)

---

(۱) لغات القرآن جلد ۲/ ۹۵۸ طبع لاہور

اور قوانین خداوندی چونکہ غیر جانب داری کی اساس پر ترتیب پاتے ہیں لہٰذا ان کے احترام اور اختیار کرنے سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا۔ ورنہ تو اسلام کی عالمگیریت کو علاقائیت کے تنگ دائرے میں محدود کر دینا ہو گا

یہاں مائدہ (۲) اور حج (۳۲) کی آیات سے مترشح ہوتا ہے کہ شعائر اللہ کا زیادہ تر حج کے مقامات یا حج کے احکام پر ہی اطلاق ہوا ہے تاہم حج کے بعض ارکان میں تہلیل و تکبیر کا عمل چونکہ شامل ہے لہٰذا اس زاویہ سے "نام خدا" کا پکارنا بھی شعائر اللہ میں شامل ہے لیکن یہ ایک ضمنی بات ہے کسی مستقل حکم کے ذریعہ شعائر اللہ سے موسوم نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان ہی اذکار و تکبیرات کو مستقل طور پر اذکار و تکبیرات ہی کے نام سے متعارف کرایا گیا ہے جو بجائے خود غماز ہے کہ۔ اللہ کا نام مشہور معنے میں استعمال کرنا شعائر کی تعریف میں نہیں آتا ورنہ تو ارکانِ حج کے علاوہ بھی انہیں شعائر کے طور پر اختیار کرنے کا اشارہ موجود ہوتا جس سے واضح ہوتا ہے کہ" اللہ" نہ کسی مذہبی نیشلٹی کی ذاتی آواز ہے نہ کسی ثقافت کا جز اور شعائر کا تتمہ۔ یہ اسم تمام حادث اوصاف سے مبرا ہے۔ قدیم ہے ازل سے تا ابد کائنات کی اندر کی پکار ہے یہ تمام مخلوق کی دلوں کا سکون اور قرار ہے۔ اس پر نہ اجارہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی قبضہ مخالفانہ۔ توحید انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اسلام سے پہلے بھی" حنفاء" کا طبقہ موجود تھا۔ اب بھی ہے اور ابد الآباد تک رہے گا وہ بغیر کسی پابندی اور ممانعت کے اللہ کا نام پکارتا تھا اب بھی پکار رہا ہے اور ابد الآباد تک پکارتا رہے گا۔ اللہ نہ کسی تہذیب کا ورثہ ہے اور نہ کسی ثقافت کا ترکہ۔ لہٰذا اسے گھر کی چیز بنا کر دوسروں کو محروم کر دینا کسی بھی ضابطہ اخلاق کی رو سے جائز نہیں ہے۔ تم جب اللہ کے نام پر پابندی عائد کرو گے تو تمہیں یہ بھی کرنا ہو گا کہ اُن کے لئے کسی علیحدہ معبود کی تخلیق بھی کر دو۔ جو نہ تمہارے اختیار میں ہے

اور نہ کسی اہل شرک کے دائرہ کار میں۔ فرمایا۔ امر لھم الٰہ غیر اللہ سبحان اللہ عما یشرکون

"کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی دوسرا خدا بھی ہے؟ (تاکہ تمہارے اعتراض پر اُسے ہی معبود بنالیں؟) اگر ایسا ہے تو اللہ کی ذات ساجھی بنائے جانے والوں سے بہت ہی بلند اور پاک ہے" (طور، ۴۳)

یہ آیت سوالیہ انداز میں احساس دلاتی ہے کہ۔ اللہ کی ذات ہی سب میں ساجھی اور سبھی کے لئے پاک و مقدس ہے اور اس کی ذات کو معبود بنانے کی پوری کائنات کو اجازت ہے جو صاحب اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے معبود کی نشاندہی کریں جسے پکارنے پر توحید میں خلل واقع نہ ہوسکتا ہو (۱)

کیا اِسلام ایک ثقافت ہے؟

ثقافت جسے انگریزی میں کلچر (CULTURE) کہا جاتا ہے جس کے درجنوں معانی ہیں

لیکن وہ یہاں مطلوب نہیں ہیں اور جسے مسلم ثقافت کہا جاتا ہے وہ خود بھی کئی ثقافتوں کا مجموعہ ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ جہیز، فنونِ لطیفہ، مصوری اور بعد از مرگ کی ناگزیر رسومات کی لاشعوری یلغار سے اسلام کی کامیاب پسپائی اور پھر خود سپردگی سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام پر باہر کی ہر ثقافت کی پرچھائیں پڑ چکی ہیں لہٰذا اس کے تہذیبی تشخص کے حوالہ سے "کلمہ طیبہ" کو معرضِ بحث میں لانا کوئی اخلاقی جواز نہیں رکھتا کیونکہ بیرونی ثقافتوں نے اسلام کو جو تہذیبی خلعت پہنایا ہے وہ اس خلعت سے مختلف ہے جو وحیِ الٰہی نے تجویز کر رکھا تھا اب تو وہ اپنوں ہی کی نظر میں اجنبی محسوس ہونے لگا ہے اب اس کا وہ مفہوم غور طلب ہے جو نئی اصطلاح کے طور پر متعارف ہے (OXFORD DICTIONARY) برطانیہ اور (UEBSTER DICTIONARY)

(۱) یہ میرا طرزِ فکر ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک قابلِ قبول ہے؟

امریکن میں جو مواد شامل ہے وہ واضح نہیں ہے تاہم۔ ثقافت کا نیا مفہوم یہ ہے کہ

- کسی تہذیب کا مخصوص مزاج جو اس کی اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں سے ظاہر ہوتا ہو
- کسی تہذیب، قوم، یا معاشرے کے مجموعی تخلیقی میلانات جو فنون لطیفہ، رسم و رواج اور شعر و ادب میں ظاہر ہوتے ہوں
- دنیا کی بے شمار قومیں مہذب ہیں لیکن ان قوموں کی ثقافت الگ الگ ہے مراد یہ کہ ثقافت تہذیب پر مستزاد ہے
- ثقافت عام طور پر شعر و ادب، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، موسیقی وغیرہ کی مجموعی صورت کو بھی کہتے ہیں
- عام طور پر ثقافت کسی معاشرے کی عمومی تخلیقی سرگرمیوں کے مجموعے کا نام بھی ہے
- تہذیب بمعنے خوب سے خوب تر کی تخلیق
- رسوم کا ترقی یافتہ مجموعہ ـــــ ان مفاہیم کے علاوہ

جدید عربی لٹریچر میں بھی کچھ مفاہیم سامنے آچکے ہیں۔ مرحلة معينة من مراحل التقدم الحضاری

- تمدنی ارتقار کا خاص مرحلہ

(المورد۔ طبع بیروت ص ۲۳۸ کالم ۱)

الثقافة۔ التمکن من العلوم و الفنون و الاداب

- فنونِ لطیفہ، شعر و ادب اور لٹریچر پر دسترس حاصل کرنا

(المنجد ۲۷ واں ایڈیشن طبع بیروت ص ۷۱ کالم ۳)

ثقافت۔ کی ان تعریفات کے تناظر میں دیکھنا یہ ہے کہ اسلام یا اسلامی عبادات

برعکس تعریف کی رو سے ثقافت کا اطلاق ہو سکتا ہے کیونکہ موجودہ تعریفات کی رو سے تغیر، تبدل، اور ہالنگ اور "ریفائیننگ" ضروری ہو جاتی ہے جب کہ ہماری دینی قیادت، فروعات میں بھی تغیر و تبدل کی قائل نہیں ہے۔ نیز "ثقافت" کا لفظ مخصوص قومی مزاج یا کسی طرح کی "قدامت" کا متقاضی بھی ہے جب کہ اس زاویہ سے ہم کسی قوم کی مخصوص تمدنی عادات کو دوسری اقوام پر مسلط نہیں کر سکتے۔ قومیں باہمی اختلاط اور میل جول سے ایک نئی تہذیب اور تمدن کو تو جنم دے سکتی ہیں مگر مذہب کے نام پر قائم کردہ کسی نئی ثقافت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتیں۔ نیز "اسلامی عبادات" "ونظریات کو ثقافت کہنے سے اسلام کی بابت اس عظمت اور قدر و منزلت کا اظہار نہیں ہوتا جو اخلاقیات کی برتری کے لئے ناگزیر ہے۔ ثقافت اگر تمدنی ارتقار کا ایک مرحلہ ہے تو وہ گذر چکا اب اس کی حیثیت عظمتِ پارینہ کی حد تک تو رہے گی مگر مستقبل کی رہنمائی اور "جدیدیت" سے عاری ہوگی ـــــ یہ اگر خوب سے خوب تر کی تخلیق کی غماز ہے تو اس مضمون کی رو سے رائج اسلام کی عمارت دھڑام سے نیچے آسکتی ہے کیونکہ یہاں اور ہالنگ اور ریفائیننگ کے لئے کسی نبوتِ جدیدہ کا اہتمام نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں نے اتنظاری پالیسی اختیار کر کے نبوت کے روشندان اور کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔ مگر عملاً شاید وہ کسی تبدیلی کے خواہاں نہ ہوں جب کہ خوب سے خوب تر کی نفسیات کے مطابق تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے!!

ثقافت کا شعر و ادب، فنونِ لطیفہ اور لٹریچر پر بھی اطلاق ہوا ہے لیکن تمام جدید نویسوں نے۔ اسلام کو "**ثقافت**" سے تعبیر نہیں کیا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہنوز یہ طے کرنا باقی ہے کہ۔ ادیان پر کھلے طور پر "ثقافت" کا اطلاق کیا نتائج پیدا کر سکتا ہے؟ ۔ نیز اسلام اگر ثقافت ہے تو سوال پیدا ہوتا

ہے کہ کس قوم کی ثقافت ہے؟ کالیڈیوں کی، آرامیوں کی، عبرانیوں کی، عربوں کی یا ایرانیوں کی؟ پھر یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ - غیر مسلم جب یہ طنز کرتے ہیں کہ اسلام عربی ثقافت ہونے کی وجہ سے عالمی اور بین الملّی دین نہیں ہو سکتا - تو اس کا جواب کیا ہوگا؟ پھر یہ کہ ثقافت بالکل ہی نئی اصطلاح ہے اس نے ابھی تدریجی مراحل طے کرنے ہیں یہ جب اپنی غرض پالے گی تب پتہ چلے گا کہ "اخلاقیات" میں اس کا کیا مقام ہے؟ - اس سے پہلے اس کے حوالہ سے کسی کو اللہ کے نام یا اسلامی مقدسات کے استعمال سے روکنے کا کوئی جواز نہیں ہے - ابھی تو اس کی متعین تعریف بھی نہیں ہوئی۔ بہر دست یہ قدامت کی غماز بھی ہے اور جدیدیت کی خواہاں بھی ایسے میں بہتر ہے کہ اسلام کو "ثقافت" کے گرداب میں ڈبونے سے احتراز کیا جائے ورنہ تو الجھنیں رونما ہوں گی اور مسائل پیدا ہوں گے - آخر میں یہ کہ اسلام جب ایک ثقافت ہے تو ہر ایک کا حق بنتا ہے کہ جونسی ثقافت چاہے اختیار کر لے - صبح کو مغل ثقافت، دوپہر کو گندھارا تہذیب اور شام کو فرہنگِ ایمانی (۱) پھر یہ عمل گردن زدنی نہیں رہے گا

کلمہ طیبہ صرف مسلمانوں کا حق ہے یا تمام انسانوں کا حق ہے؟

یہ عنوان ہے معاصر امن کراچی کا جس کے مندرجات کو مشہور کالم نگار جمعہ خاں نے تحریر کیا ہے اور ہمیں اس وقت میسر آیا جب کتابت آخری مراحل میں تھی اور ایک اصولی حقیقت کو چونکہ ایک صحافی نے زینتِ قرطاس بنایا ہے لہٰذا اس قابل ہے کہ ناظرین کے لئے بلفظہٖ پیش کیا جائے - چنانچہ صفحات کی نئی ترتیب کے ساتھ اقتباس حاضر ہے -

(۱) فارسی میں "فرہنگ" کا لفظ "ثقافت" کے لئے استعمال ہوتا ہے -

" کلمہ طیبہ کا احترام ہر مسلمان کے لیے لازم ہے لیکن پاکستان میں اس مسئلہ پر بہت نازک صورت حال پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف شہروں سے یہ خبریں آتی رہی ہیں کہ وہاں کچھ لوگ گرفتار کیے گئے جنہوں نے اپنے سینے پر کلمہ طیبہ کا بیج لگا رکھا تھا۔ اِن کو اس وجہ سے پکڑا گیا کہ وہ احمدی، قادیانی یا۔ لاہوری گروپ سے وابستہ تھے جنہیں آئین کے تحت غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس طرح اس گروپ کی عبادتگاہوں کے دروازوں پر کندہ کلمہ طیبہ مٹانے کا حکم جاری کیا گیا جب اس کو مٹانے ..... سے انکار کیا گیا تو پولیس کی نگرانی میں زبردستی یہ کلمہ مٹوایا گیا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب کوئی مسلمان اس گروپ کی عبادت گاہ کے دروازہ سے کلمہ مٹانے یا کھرچنے پر تیار نہ ہوا تو خاکروبوں کو طلب کیا گیا جن کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا انہوں نے بھی انکار کیا تو جیل سے ایسے قیدی بلوائے گئے جو طویل قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پر صرف مسلمانوں کا حق ہے یا تمام انسانوں کا حق ہے؟ کیا ہم کسی ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی ..... کو کلمہ طیبہ پڑھنے پر سزا دینے کا اختیار رکھتے ہیں؟ کیا انہیں اپنے گھر میں دکان میں یا دفتر میں کلمہ طیبہ کا طغرٰے آویزاں کرنے سے منع کر سکتے ہیں؟ اگر کوئی غیر مسلم قرآن مجید پڑھتا ہو یا نماز ادا کرے تو کیا ہم ان کو ایسا کرنے سے روکیں اور یہ کہیں کہ جب تک تم شریعت کے تمام تقاضے پورے کر کے مسلمان نہیں ہو گے اس وقت تک تمہیں قرآن مجید پڑھنے یا نماز ادا کرنے کا حق نہیں کیا ہم یہ شرط رکھیں کہ اگر کوئی غیر مسلم، کلمہ طیبہ سے عقیدت رکھتا ہو یا اس پر ایمان رکھتا ہو تو کلمہ طیبہ کے استعمال کے

وقت خود کو واضح طور سے غیر مسلم بھی ظاہر کرے ۔

(روزنامہ "امن" کراچی ۸ فروری ۱۹۸۷ء صفحہ ۲ کالم ۸)

اس اداریئے کا پس منظر یہ ہے کہ جن مہاجرین کے سہارے جماعت اسلامی نے بھٹو حکومت کا خاتمہ کیا تھا ایک مرحلہ پر یہ مہاجر اس کے مخالف ہو گئے تھے کیونکہ ۸ جنوری ۱۹۸۷ء کے مہاجر پٹھان فسادات میں جماعت نے پٹھانوں کا ساتھ دیا تھا کہ اس کے مالی مفادات اسی کے متقاضی تھے ۔ اب ہوا یہ کہ جماعت کی اس جانبدارانہ حرکت پر مہاجرین کو دلی صدمہ پہنچا اور انہوں نے جماعت کے کچھ پرچم جن پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا جلا ڈالے اس پر جماعت کے دیوتاؤں نے "اللہ کے غضب" کی دھونس جما کر کلمہ جلانے والوں کو جہنم بھجوانے کی دھمکی دے دی ۔ تمیزہ خاں کو دونوں فریقوں کی بات ناگوار گذری اور مہاجرین کی حرکت پر افسوس کے بعد لکھتے ہیں کہ

"اگر جماعت اسلامی کا ایسا پرچم جلے جس میں کلمہ طیبہ درج ہو تو ہم یہ کہیں کہ ۔ اس پرچم کو جلانے والوں پر اللہ کا عذاب نازل ہو گا ۔ لیکن ہم خود اپنے ہاتھوں سے کسی جگہ پر لکھا ہوا کلمہ طیبہ کھرچیں یا مٹائیں تو اُسے جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دے کر دل میں یہ سمجھیں کہ اب ہمیں جنت میں محل مل جائے گا ۔ اگر ہمارے نزدیک کوئی شخص غیر مسلم ہے مگر کلمہ طیبہ سے عشق رکھتا ہے تو ہمارے علمائے دین کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ تبلیغ کے ذریعے اس کو اچھا مسلمان بنانے کی کوشش کریں ۔ دین کے معاملہ میں جبر سے ہرگز کام نہیں لینا چاہیئے ۔ اور نیت کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔" (حوالہ مذکور کالم ۵ ۔ آخری حصہ)

لیکن جن کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ "اچھائی" کیا ہوتی ہے وہ اچھے مسلمان بنانے کا جتن کیسے کریں؟ آج احمدیوں کو چھوڑ ۔ ان کے ڈر کی وجہ سے ایک راسخ العقیدہ

مسلمان بھی کلمہ کے استعمال سے گریز کرتا ہے کہ کہیں مرزائیت کے گمان پہ اسے کسی طرح کی جسمانی سزا سے دوچار نہ کر دیا جائے میں ایک راسخ العقیدہ موحد ہوں ، رسالتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو - مہدی، مسیح، مجدد، محدث، ردیا - اور بشرات وغیرہ آلودگیوں سے پاک وصاف سمجھتا ہوں کیونکہ - نزولِ قرآن کے بعد رواجی نبوتوں کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے - تاہم جب سے مدینہ منورہ سے وطن مالوف لوٹا ہوں - یہاں کے کلمہ شکن ، ماحول سے خائف ہو کر - احتیاط کو شیوہ بنا چکا ہوں - پہلے بریلویوں کا ڈر تھا کہ توحید سے چڑتے ہیں اب توحید کے دعویداروں سے خطرہ کہ ان کے نزدیک کلمہ ، ایک اقلیت کا شعار بن چکا ہے - بس اب تو رام ہی کہہ لیا کرے !!

"اللہ" غیر جانبدار ہے

وحی الٰہی نے اپنے بلیغ اسلوب فہمائش میں ذہن نشین کرایا ہے کہ - اللہ غیر جانبدار ہے لہذا اسلام فریق نہیں بن سکتا - فرمایا -

اللہ ــــ رب العالمین - ہے (الحمد ۱) ــــ صرف ــــ رب المسلمین - نہیں ہے ،

محمد ــــ رحمۃ للعالمین - ہیں (انبیاء ۱۰۷) ــــ صرف ــــ رحمۃ للمسلمین - نہیں ہیں

قرآن ــــ بیان للناس - ہے (عمران ۱۵۸) ــــ صرف ــــ بیان للمسلمین - نہیں ہے

کعبہ ــــ مثابۃ للناس - ہے (بقرہ ۱۲۵) ــــ صرف ــــ مثابۃ للمسلمین - نہیں ہے ،

"مسلم" ابراہیم بھی ہے (انعام ۱۶۳) اور نوح بھی (   ) سلیمان بھی ہے (نمل ۴۴) اور بلقیس بھی (نمل ۴۴) اسماعیل بھی مسلم ہے (مائدہ ۱۰۳) اور یوسف بھی (۱۵۱) عیسیٰ بھی مسلم ہے (   ) اور سیدنا محمد علیہ الصلاۃ والسلام بھی - اس طرح اسلام نہ صرف تمام انبیاً اور مصلحینِ انسانیت کا عقیدہ ہے اپنی سائیکالوجی کی رو سے غیر جانبداری کا سمبل بھی ہے لہذا - ربِ العالمین

رحمۃ للعالمین، نذیر للعالمین، بیان للناس، مثابۃ للناس اور مسلم۔ کے امتیاز پر قبضہ مخالفانہ جماکر۔ اللہ کی ربوبیتِ عامہ، حضور کی نذارت اور غیر مختص رحیمی۔ قرآن کی ہدایتِ عام اور کعبہ کا سب کے لئے جائے پناہ بننے اور مسلم کے وسیع تر مفہوم کو محدود، مختصر کرنا بڑی ستم ظریفی ہے

ہم جزئیات کو ملحوظ رکھ کر یہ تو کر گذرتے ہیں کہ "مرتدین" اور کفار کو۔ اللہ کا نام استعمال کرنے سے قہراً روک دیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام کے چند "کلیات" بھی ہیں جو اپنے مزاج اور نفسیات کے اعتبار سے تعصب، تنگ ظرفی اور جانب داری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کلیات میں سے ایک بنیادی کلیہ "توحید" بھی ہے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ توانا "سپر" ہے جو اپنے ماننے والے کا بھرپور انداز سے محافظ ہے اور ایک شخص جب "موحد" ہے اور اپنی گروہی وابستگی ختم کر کے صرف توحید پر ہی گذارا کرنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے اس پر "مرتد" کا اطلاق کر کے بھی قتل نہیں کیا جا سکتا کہ اہلِ توحید کا قتل کرنا مطلوبِ شرع نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک موحدین کی پاسبانی اور حفاظت کرتا ہے۔

باطن کے جھروکوں میں جھانکنا رسولؐ کی عادت نہیں تھی

یہ درست ہے کہ "مسلم" کی تعریف میں تمام فرقے اپنی رائے رکھتے اور گروہی تعریفات سے سر مو انحراف نہیں کرتے۔ تاہم روایات کو مفاہیم کے سانچے میں ڈھالنے کے باوصف اگر یقین کر لیا جائے کہ ذیل کے الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ارشاد فرمودہ ہیں تو ہمارے دینی پہلوانوں کو یہ معلوم کر کے مایوسی ہو گی کہ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی فیصلہ ان کے فتوے اور مذہب کی نفی کرتا ہے۔ فرمایا۔ من صلی صلاتنا واکل ذبیحتنا واستقبل

قبلتنا فذالك المسلم الذی له ذمة الله وذمة رسوله فلا تخفروا الله فی ذمته

"جس نے ہماری طرح صلوٰۃ قائم کی ہمارا ذبیحہ تناول کیا اور ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ سمجھ کر اس کی طرف رخ کیا تو وہ ایسا "مسلم" ہے جسے اللہ اور رسول پروانۂ حفاظت عطا کرتے اور ہر قسم کی اذیت سے تحفظ عنایت فرماتے ہیں پس اے لوگو! اللہ کے پروانۂ حفاظت کی ہتک نہ کرنا۔"

(بحوالہ ۔ اصول الدین مصنفہ امام فخر الدین رازی طبع قاہرہ صفحہ ۱۳۲ سطر ۱۰ تا ۱۲)

یہاں حدیث کا پہلا حرف "مَن" ہے جو اصولِ عربیت کے لحاظ سے "عموم" کا صیغہ ہے یعنے کوئی بھی فردِ بشر، منافق ہو، مرتد ہو، اہل کتاب ہو، مشرک ہو۔ یا ہم پر ایمان نہ رکھتا ہو ۔ وہ اگر ہماری عبادات، معاشرتی عادات اور اجتماعی طور طریقے اپنا تا یا اپنائے رکھتا ہے تو اُسے اللہ کی جانب سے شہری، مذہبی، سیاسی اور سماجی حقوق حاصل ہوں گے اور قانونی داخلی تحفظ مستزاد۔ اور اِسی مناسبت سے امام رازی فرماتے ہیں کہ ان العلم بهذه المسائل لو كان شرطا لصحة الايمان لكان يجب ان لا يحكم النبى بايمان احد الا بعد ان يسأله عنها ولما لم يكن كذالك بل كان يحكم بايمانهم من غير ان يسألهم عن هذه المسائل علمنا ان الاسلام لا يتوقف عليها

"اگر اندرونی حالت کی بابت سوال و جواب ایمان کی پختگی کے لئے شرط ہوتے تو ضروری تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دریافت کئے بغیر کسی بھی انسان کو مؤمن نہ کہتے۔ لیکن حدیث ہذا کو دیکھنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ آپ نے کسی سے کچھ بھی تفصیلات دریافت نہیں فرمائیں
جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کسی کے پوشیدہ عمل (اور عقیدے)
سے تعرض نہیں کرتا۔ ظاہر پر نظر رکھتا ہے۔

(اصول الدین طبع مصر ص۱۳۲/۱۲ تا ۱۵)

مساجد سے نکال دینے والے کا انجام

یہ حدیث اور اقتباس واضح کرتے ہیں کہ ـــ انسان "اندر" میں کفر کا متوالا ہی کیوں نہ ہو ـ ظاہری طور پر اگر اسلامی طریقے پر عبادات ادا کرنا چاہتا ہے تو اُسے نہ تو عبادت سے روکا جا سکتا ہے اور نہ ہی خانۂ خدا سے بدر کیا جا سکتا ہے کیونکہ نساء (۹۰) کی طرح انعام (۵۲) بھی اپنے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے اُن افراد کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے سے روکتی ہے جو کسی بھی مرحلے پر ـ یادِ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں ـ یہاں انعام (۵۲) کا سببِ نزول اگرچہ خاص بتلایا جاتا ہے مگر فقہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ ـــــ "مورد اگرچہ خاص ہو مگر حکم عام ہی تصور ہوگا" ـ اس وضاحت کے بعد آیہ مبارکہ ملاحظہ ہو۔ فرمایا۔

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ ـ ما علیك من حسابھم من شیئٍ وما من حسابك علیھم من شیئٍ فتطردھم فتکون من الظالمین ٥

" اور اے پیغمبر اِن لوگوں کو جو صبح و شام خدا کے حضور مناجات کرتے اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اپنے پاس سے نہ نکالو ـــ ان کے کاموں کی جواب دہی تمہارے ذمے نہیں ـ نہ تمہاری جواب دہی اُن کے ذمہ ہے کہ (اس ڈر سے) نکال دو۔ اگر ایسا کرو گے تو زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے" ـــــ (انعام ۵۲)

یہ آیت غیر مسلموں اور "مرتدوں" کے اعمالِ صالحہ اور عقیدۂ توحید کی نفی نہیں کرتی اور اسی ہی اساس پر واضح کرتی ہے کہ کوئی سا انسان۔ جب نامِ خدا لینا چاہے تو اس سے بدسلوکی نہ ہونے پائے۔ الذین۔ اسمائے موصولہ میں سے ہے جو گرامر والوں کے نزدیک صرف "عموم" کا مفہوم دیتا ہے یعنے تمام ایسے لوگ جو یادِ خدا کو مشغلہ بنائیں بلا امتیاز اس قابل ہیں کہ انہیں مارا نہ بھگایا جائے۔ عربی میں "طرد" کا لفظ ایسی تادیبی کارروائی سے تعبیر ہے جو کسی ناپسندیدہ عمل پر کی جاتی ہو(۱) لیکن خدا کا نام لینا کسی بھی طرح ناپسندیدہ عمل نہیں ہے کہ کسی بھی غیر مسلم سے سرزد ہوتے ہی قابلِ تعزیر ٹھہرایا جا سکتا ہو؟

امام محمد عبدہ (۱۹۰۵ء م) فرماتے ہیں ان الطرد لو حصل یکون حکما غیر جائز ممن لا یملك الحکم لذاته (ان الحکم الا للہ) واللہ لم یفوض الیہ ھذا النوع منہ۔

"اور پسندیدہ (از نامِ خدا کے استعمال کرنے کے) عمل پر مار بھگانے کی کارروائی اگر کہیں عمل میں آ بھی جائے تو یہ سراسر نادرا حرکت ہو گی۔ اور جو لوگ حکمِ ذاتی (خدائی اختیارات) کی صلاحیت سے محروم ہیں اُن کو تو یہ اختیار ہی نہیں کہ نامِ خدا لینے والوں کو بھگا دیں؟"
(تفسیر "المنار" طبع مصر جلد ۷/۴۳۹)

اسی مضمون کو۔ وحیِ قرآنی یوں بیان فرماتی ہے ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ وسعیٰ فی خرابھا

"اس سے بڑھ کر ظلم کرنے والا انسان کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی عبادت گاہوں میں اس کے نام کی یاد کو روکے اور ان کی ویرانی

---

(۱) تفسیر "المنار" جلد ۷/۴۳۸/۶

میں کوشاں ہو؟"

(بقرہ، ۱۱۴- ترجمان القرآن جلد ۱/ ۲۵۰)

یہاں آیۂ کریمہ کا " مَن " کے استفہامیہ حرف کے ساتھ آغاز فرمایا ہے۔ جو بظاہر مفرد ہو کر بھی عموم کا متقاضی ہے یعنے۔ یادِ خدا سے روکنے والا ایک ہو خواہ بہت سارے جو کوئی بھی ہو اگر " توحید " کے اعلان میں رکاوٹ بنتا یا اعلان کرنے والے کو جسمانی و اعصابی اذیت سے دوچار کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ظالم ہے۔

عورت اور مسئلۂ امارت

اسلام میں عورت کی سربراہی کے موضوع پر انقلاب آفرین تحقیق

یعنی

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندی کے اصول و نظریات کی روشنی میں فقہاء اور محدثین کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی فکر کی تاریخ میں عورت کی امارت اور سربراہی کبھی قابلِ اعتراض نہیں رہی

رحمت اللہ طارق

باب پنجم

گستاخیِ رسولؐ کا مسئلہ

جس طرح "مسلم" اور "مرتد" کی متفقہ اور علمی تعریف نہیں کی گئی اسی طرح "گستاخیِ رسولؐ" کا مفہوم بھی دانستہ ہی مبہم رکھا گیا ہے۔ یا یہ کہ مسلم اور مرتد کی طرح "گستاخِ رسولؐ" کی تعریف کرنے سے بھی یہ لوگ عاجز تھے ۔۔۔۔۔ یہ درست ہے کہ ۸۶ء میں نامزد اسمبلی نے گستاخِ رسولؐ کی سزا عمر قید یا موت مقرر کی ہے لیکن جب تک یہ طے نہ ہو کہ "گستاخی" کی تعریف کیا ہے؟ اور گستاخِ رسولؐ کسے کہتے ہیں بات آگے نہیں بڑھ سکتی ۔۔۔۔۔ حبِ رسولؐ ہر مسلمان کا حاصلِ ایمان ہے۔ لیکن اسے کاروباری مقاصد کے لئے تجارت کا مال بنانا بجائے خود گستاخی ہے۔

لوگ کہتے ہیں۔ وہابی گستاخِ رسولؐ ہیں۔ سر سید۔ ولی اللہ۔ احمد شہید۔ شاہ اسماعیل اور ان کے پیروکار جو کروڑوں کی تعداد میں ہو گذرے ہیں تیز گستاخِ رسولؐ تھے ۔۔۔۔۔ لیکن قانون کی نفسیات کا شعور رکھنے والے کسی جذباتی رَو میں بہ کر مسائل و احکام کا تجزیہ نہیں کرتے۔ وہ "فتویٰ" کی زبان میں "گستاخ" قرار دیئے جانے والوں پر فردِ جرم نہیں لگاتے۔

احمدیوں کو کافر قرار دیتے وقت میں نے ایک ہائی اتھارٹی سے عرض کیا تھا کہ ۔۔۔۔ اسمبلی کی سٹیج پر تو صرف داخلی و خارجی معاملات ہی زیر بحث آنی چاہئیں مذہبی معاملات کو گھسیٹ لانے سے الجھنیں بھی پیدا ہوں گی، اسلام اور پاکستان

کی رسوائی بھی! مجھے کہا گیا کہ موجودہ حکومت کو ایک منظم سازش کے ذریعہ ناکام بنایا جارہا ہے ۔ ایسے میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر ہی محفوظ کیا جا سکتا ہے ورنہ تو مسلمان جس مار دھاڑ کے عادی بن چکے ہیں احمدی کشتوں کے پشتے لگا دیں گے۔

یہ جواب مجھے تو کیا مطمئن کر سکتا تھا یقین واثق ہے کہ وہ خود بھی مطمئن نہیں ہوئے ہوں گے ۔ تاہم میں نے اگلے سوال کی نوعیت بدلتے ہوئے اپنا شبہ ظاہر کیا کہ ــــــ مسلمان بلا امتیاز فرقہ جات "انتظاری" عقیدے پر سختی سے قائم ہیں اور نبوت کا دروازہ بند کرنے کے باوصف "آنے والے" کے لئے چشم براہ بھی ہیں جو بجائے خود "گستاخیٔ رسول" بھی ہے اور ایمان کو نئی رسالت کی طرف منتقل کرنے کی جسارت بھی! لہٰذا بات کو کسی بھی دو رنگی چال سے انجام تک پہنچانا غیر معقول ہے ــــــ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ ــــــ بحالاتِ موجودہ مولوی حضرات اس سے کم پر خاموش نہ بیٹھیں گے ــــــ اس پر بات کو نیا رخ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ ــــــ خاموش تو یہ لوگ ہو نہیں سکتے لیکن اس طرح معاملہ کی جو صورت بن رہی ہے وہ یہ ہے کہ ــــــ جس چیز کے باعث کنوئیں سے پانی نکالا جارہا ہے وہ چیز بدستور کنوئیں ہی میں پڑی رہے گی لہٰذا جب تک اس "مردار" کو نکال باہر نہیں پھینکا جاتا کنواں پاک نہیں ہو سکتا ۔ اجراءِ نبوت کی اساس احادیث پر ہے اور ۔ یہ احادیث "صحاح ستہ" میں موجود اور مسلمانوں کو "نئے ظہور" پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہیں اب اس "خرابی" کا تدارک اگر مطلوب تھا تو چاہیئے تھا کہ ۔ اجرائے نبوت کو "گستاخیٔ رسول" کے مترادف جرم قرار دے کر یا تو تمام کتابوں کو خلافِ قانون قرار دیا جاتا یا ان میں سے گستاخیٔ رسول کے ابواب حذف کر دیئے جاتے جو کہ ناممکن تھا ۔ اور اس کے بغیر

"حُبِ رسول" یا "ختمِ نبوت" کے برگ و بار بے ثمر ہی رہیں گے ـــــ پھر اسمبلی کے ذریعہ تحلیلِ مسائل کا جو طریقہ آپ نے وضع کیا ہے مستقبل میں یہی طریقہ ہم سب کے گلے کا پھندا بن جائے گا۔

یہاں تک بات ختم ہو گئی اور بعد کے واقعات نے اس حقیقت کی تصدیق کر دی کہ ـــــ تکفیر و تفسیق کا سلسلہ اس زور دار طریقے سے چل پڑا کہ کراچی کے بعض مولویوں نے سوشلزم کو بہانہ بنا کر ایک قانونی حکومت کا تختہ بھی الٹ دیا اور اپنی ہی حکومت کی موجودگی میں نظامِ مصطفےٰ والوں نے بے گناہ لوگوں کے گھر جلائے، قتل کیا، عصمتیں لوٹیں، زندہ انسانوں کو نذرِ آتش کیا۔ سوشلزم کو ارتداد سے زیادہ سنگین جرم ٹھہرا کر پیپلز پارٹی کے افراد کو مسجدوں سے روکا گیا۔ ان کے بچوں کو مسجد مکتبوں میں۔ قرآن پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔ رشتے منقطع ہوئے۔ طلاقیں دلوائی گئیں۔ جنازے نہیں پڑھے گئے اور نہ معلوم مذہبی قیادت کے جنون اور عقل باختگی نے کیا کیا مظاہرے کئے؟

ہاں تو بات ہو رہی تھی "گستاخِ رسول" کی منطقی تعریف کی۔ تو جناب وہ معلوم نہ ہو سکے گی کیونکہ منطقی "تعریف" متعین ہو جانے کی صورت میں جب کوئی چیز "قانونی" "ضبط" میں آ جائے گی تو آسانی سے کسی کو "گستاخ" ثابت نہیں کیا جا سکے گا لہٰذا ان لوگوں کا مفاد اسی میں رہا ہے کہ یہ "اشیاء" کی سائنٹفک تعریف نہ کریں اور وقت آنے پر ہر مخالف کا سر قلم کرنے کے لئے غیر معین تعریف کا سہارا لے کر من مانی کرتے رہیں۔

اہانتِ رسولؐ کا انجام

مذہبی قیادت نہ تو مقامِ مصطفےٰ کا احساس کر سکتی تھی نہ اسے شعور تھا کہ عصمتِ نبی کیا ہوتی ہے؟ ـــــ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ـــــ نبی کی رداءِ عصمت کو

لبید جیسے یہودی نے تار تار کیا تھا[1] ——— وہ ایمان لائے ہیں کہ ——— رسالت مآب اہلِ کفر کی دل جوئی کے لیے نمازِ صبح میں ۔ تلك الغرانیق العلیٰ وان شفاعتهن لترتجیٰ[2] ——— جیسے کفریہ کلمات زبانِ اقدس پر لائے تھے؟* لیکن اہانتِ رسولؐ کے اِن شرمناک واقعات کے باوصف اِن لوگوں نے اہلِ روایت کے لیے نہ تو عمر قید کی سزا مقرر کی ۔ نہ ہی ذائقہ موت چکھایا ۔ جس سے ان کی ملی بھگت اور اہانتِ رسولؐ پر رضامندی کا اظہار بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اہانت کے ضمن میں راویانِ احادیث کی زبان اگر پہلے ہی مرحلے پر کاٹ دی جاتی تو آج ہمیں کسی طرح کی سزا تجویز کرتے وقت بلوں اور آرڈیننسوں کا سہارا نہ لینا پڑتا ۔ اب باوصف کہ ہمارے سامنے گستاخِ رسولؐ کی متعین تعریف نہیں اور باوجود سے کہ سزا کا کھوج بھی نہیں مل رہا ۔ اس کے باوجود ہمارا ایمان ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی وقت اپنے کسی گستاخ کا سر قلم کرانے کا الزام اپنے سر نہیں لیا ۔[3] بخاری میں

(۱) بخاری بحوالہ روح المعانی طبع مصر جلد ۳/ ۲۸۲/ ۲۲ تا ۲۴ ۔ تفسیر ابن کثیر طبع مصر جلد ۴/ ۵۲۴، ۵۲۵ (۲) بخاری مع فتح الباری طبع بولاق ۱۳۰۱ھ جلد ۸/ ۳۳۳/ ۳۳۴ (۳) ایک مسلمان نے راجپال آریہ سماجی کو " اہانتِ رسولؐ " کے جرم میں قتل کر دیا تھا ۔ جس سے متاثر ہو کر ایک ہندو اہلِ علم نے امام الہند مولانا آزاد سے استفسار کیا کہ ۔ کیا یہ فعل اسلام کی پالیسی سے تعلق رکھتا ہے ؟ مولانا نے مستفسر کو ایک مدلل اور بالتفصیل جواب مرحمت فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

" قتل کے جس واقعہ کے پسِ منظر میں سوال کیا گیا ہے اسلام کی نسبت ایسی مجنونانہ تعلیم کا تصور بھی کرنا اس کے خلاف سخت سے سخت اتہام ہے ۔ ——— نعوذ باللہ اگر اسلام کی ایسی تعلیم ہو ——— اور اس نے اپنے پیروؤں کو قتلِ انسانی کا پروانہ دے دیا ہو " ——— (مکالمات ابوالکلام ۔ طبع دکن ۱۹۴۴ء ص ۲۰۹)

باقی اگلے صفحہ پر

* ایمان سوز اس فقرے کا ترجمہ ہے کہ بلاشبہ عرب کے یہ عالی مرتبہ اصنام اس پوزیشن میں ہیں کہ ۔ لوگوں کی نجات کے لیے کچھ کرسکیں

انس بن مالک اور عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ۔ یہودیوں کا ایک وفد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا اور کہا "السام علیک"
"تم پر موت مسلط ہو۔ تباہی وارد ہو۔ اس پر صحابہ نے کہا یا رسول اللہ (علیک السلام) کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ان نابکاروں کو قتل کر دیں؟ آپؐ نے فرمایا قتل نہیں۔ بس یہ کہو کہ۔ اہل کتاب جب تم پر سلام کریں تو جواب میں صرف "علیکم" کہو۔ آگے نہ بڑھو یعنے "السلام" نہ کہو"

(بخاری مع فتح الباری جلد ۱۲/ ۲۸۰ حدیث ۶۹۲۶۔ ۶۹۲۷ و ۶۹۲۸ نیز جلد ۱۱/ ۴۱ تا ۵۴)

ان احادیث کا امام بخاری نے عنوان باندھا ہے "جب کوئی غیر مسلم۔ نبی کو گالی دے اور ننگے الفاظ استعمال نہ کرے"۔ یہ تو تھا۔ غیر مسلم دشنام طراز کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی فیصلہ۔ لیکن حافظ ابن حجر نے ان جنوں علما اور فقہا سے نقل کیا ہے کہ وہ "دشنام طراز" کو قتل کر دینے کا فتوے دیتے تھے (حوالہ مذکور ص ۲۸) اس کے معنے یہ ہوئے کہ "گالی" جس سے مخالف کی "اہانت" ہی مقصود ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جرم ہے مگر گردن زدنی نہیں اور فقہا کی نظر میں جرم بھی ہے اور گردن زدنی بھی! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

اور اگر کوئی غیر مسلم دلی خباثت کا مظاہرہ کرتا ہو۔ زبان سے خباثت اگل ہی دیتا ہے تو بھی فقہ اسلامی میں اس کا قتل متنازعہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک غیر مسلم کے اس طرز عمل سے چونکہ اس کا ذمہ اور عہد باقی نہیں رہتا لہٰذا اسے قتل کر دینا "بد عہدی" کی ذیل میں نہیں آتا لیکن سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ۔ اور حنابلہ وشوافع کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ کسی طرح کی گستاخی سے کسی معاہد۔ ذمی، مرتد اور غیر مسلم کے سماجی اور مدنی حقوق متاثر نہیں ہوتے لہٰذا۔ ان کا عہد اور ذمہ بھی ٹوٹ نہیں پاتا۔ بنابریں قتل کرنا روا نہیں ہے۔

(تفصیل ملاحظہ ہو مکالمات ابوالکلام ص ۲۱۴ مع تفصیل ص ۱۹۹ تا ص ۲۱۶)

امام طبرانی نے ایک حدیث پیش کی ہے جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فحش بکنے والے کی سزا قتل ٹھہرائی گئی ہے

جی ہاں — روایت کی حد تک یہ بات سچ ہے لیکن ایک تو "قتلِ نفس" کے بارے میں قرآن کے الفاظ میں قطعی حکم ملنا چاہیئے۔ جس کا یہاں فقدان ہے دوسرا یہ کہ یہاں سنیوں نے اخوانِ شیعہ اور خوارج کو اعتماد میں نہیں لیا کیونکہ اس روایت کے دوسرے حصے میں ہے کہ جو لوگ صحابہؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز و تشنیع کی زبان دراز کریں انہیں درّے لگائے جائیں۔ وغیرہ۔ اس طرح اس روایت کا پہلا حصہ قرآن کے صریحاً منافی ہے اور دوسرا۔ سید قطب، مودودی اور دیگر غیر سنیوں کے خلاف — قطع نظر اس کے اگر راویوں کا محاسبہ کیا جائے تو اکثر کی بابت معلوم کر کے ہمارے ذکی الحس حضرات کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ تاہم اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور قرآنِ حکیم کی منصفانہ پالیسی کو درمیان میں نہ لایا جائے تو سیاسیاتاً کسی بھی دریدہ دہن اور دل آزار انسان کو جسمانی تعزیہ اور حبسِ زنداں کی سزا سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔

یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ — اگر کوئی مسلمان۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اس کی سزا کیا ہے؟ اس کے جواب میں۔ ابنِ جریر نے خطابی، ابنِ بطال، لیث، شافعی، احمد، اسحاق۔ مالک اور اوزاعی سے قتل کا فتوٰے نقل کیا ہے (فتح الباری ۱۲/۲۸۱/۱۲ تا ۱۶) اور یہی علماء۔ اسے مرتد بھی کہتے تھے۔ جو ان کے نقطۂ نظر سے نیز قابلِ "موت" جرم ہے۔ لیکن یہاں مرتد کے مفہوم میں ایک ٹیکنیکل خامی پائی جاتی ہے کیونکہ سابقہ میں۔ مرتد۔ کے معنے کئے گئے تھے کہ جو شخص ایک مذہب کو چھوڑ کر یا قابلِ فہم زبان میں یہ کہ جو اسلام سے منحرف ہو کر کوئی سا دوسرا مذہب اختیار کر لے وہ مرتد ہے۔ لیکن

یہاں دشنام طراز نے اپنی عاقبت تو خراب کر لی مگر کسی دوسرے مذہب سے وابستہ نہیں ہوا ایسے میں اسے مرتدوں کے زمرے میں کیوں رکھا گیا؟ ـــــ پھر اگر وہ مرتد ہی ہے تو ظاہر ہے اہل ارتداد کے بارے میں دو مختلف فیصلے موجود ہیں فقہاء اگر اسے موت سے ہمکنار کرتے ہیں تو قرآن پاک موت کی نفی کرتے ہوئے زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی قسمت کا قطعی فیصلہ دشوار ہو چلا ہے۔ تاہم قرآن پاک نے اپنے بلیغ اسلوب فہمائش میں دشمنان رسولؐ کے لئے جسمانی سزا کا اشارہ تو نہیں فرمایا۔ دخول جہنم کی خوشخبری ضرور دی ہے فرمایا۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولیٰ ونصلہ جہنم وساءت مصیرا ۝

" سچائی واضح ہونے کے بعد بھی جو کوئی (ہمارے) رسولؐ کی مخالفت کرتا اور غیر مسلموں کی راہ چلتا ہے تو وہ جہاں کا رخ کرے گا اسی پہ چلایا جائے گا اور انجام کار اسے جہنم کا مزہ چکھایا جائے گا۔ اور یہ بہت ہی برا انجام ہے۔" (نساء: ۱۱۵)

یہاں آیہ کا پہلا حرف " مَنْ " عموم کا متقاضی ہے۔ یعنے مخالفت رسولؐ کا مرتکب کوئی بھی ہو۔ یہودی ہو مجوسی ہو مسیحی ہو یا مسلمان ہو ـــ اس کی سزا جہنم ہے ـــ اور مخالفت کا خمیر نفرت اور اہانت سے اٹھتا ہے۔ اس طرح یہاں مسلمان کی اہانت رسولؐ کا واضح طور پہ ذکر فرما کر جسمانی سزا کو جہنم کی سزا میں بدل کر بات ختم کر دی۔ ویسے بھی ایک انسان جب تک مسلمان ہے گستاخ رسولؐ نہیں ہو سکتا ہاں کسی بدنہاد کا دماغ آؤٹ ہو جائے اور وہ طیش میں آ کر اپنی بدزبانی کا ذات خداوندی اور شان رسول اقدسؐ کو نشانہ بنائے یا قرآن پاک کو زمین پہ پٹخ دے تو عین ممکن ہے لیکن ایسے ہی خفیف الدم (ہولے) انسان کی یاوہ گوئی پہ اگر موت

یا عمر قید کی سزا تجویز ہو سکتی ہے تو قابلِ تسلیم ہے لیکن پھر ایسا کوئی گھر نہ ہوگا جہاں زندگی کے طویل سفر میں کسی سے گستاخی نہ ہوئی ہو؟ پھر یہ گستاخی نہ صرف عامۃ الناس کی جہالت کی مرہونِ منت ہی ہوگی گروہ علماء کی علمیت بھی ایسے گل کھلا سکتی ہے۔ میں نے جنگ ۱۹۸۵ء کے کسی شمارے میں پڑھا تھا کہ حنفیوں کے دو دھڑے (ان میں سے ہر گروہ شاہی مسجد لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ دونوں کے مجاہدینِ اسلام اپنے اپنے علماء کی قیادت میں کفن بردوش مسجد کی طرف رواں دواں تھے اور جب معرکہ آرائی نے رنگ جما لیا تو ایک فریق نے تکبیر کے نعرے بلند کئے اور دوسرے نے جواباً نعرۂ رسالت کے! پھر اسی رزمگاہِ اسلامی میں ایک دھڑے کے لوگوں نے بلند آواز سے کہا نعرۂ "رسالت" ۔ حامیوں نے جواب دیا۔ یارسول اللہ منافقوں نے گرہ لگائی "مردہ باد" ۔۔۔۔ (العیاذ باللہ) ۔۔۔۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جہادِ اسلامی کی دونوں افواج میں زور کا رن پڑا اور ہر ایک نے دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اللہ اور رسولؐ کو جی بھر کر استعمال کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ مسلح انتظامیہ نے دونوں دھڑوں کو نکال باہر کر دیا ۔۔۔۔ اس کے بعد معلوم نہیں "مردہ باد" کہنے والے علماء اور ان کے حامیوں سے بازپرس ہوئی کہ نہیں؟ شاید کہ معاملہ ٹھپ کر دیا گیا ہو کیونکہ گستاخیٔ رسولؐ کی سزا عام گستاخوں کے لئے ہوتی ہے علماء حضرات جو چاہیں کریں ان پر تعزیر ہے نہ گرفت!

اور ہاں اگر لوگوں کی ہذیانی بکواس یا تحریر کو گستاخیٔ رسولؐ کا معیار بنایا جا سکتا ہے تو یہاں کسی راجپال، شردھانند اور دیانند کے نالطے سے نہیں اسلامی راجپالوں، اور شردھانندوں کے ہاں بھی گستاخیٔ رسولؐ کا مواد مل سکتا ہے اور بہتر ہے کہ باہر کے گستاخوں کا گھر اشناک کرنے کی بجائے گھر کے دریدہ دہنوں کا محاسبہ

---

(۱) مدینہ منورہ میں

کیاجائے؟ - مولانا مودودی اور محدثین کرام نے ایسی گھناؤنی باتیں محفوظ کر رکھی ہیں جن کی روشنی میں رسولِ اکبر و اعظم کی شان گھٹا جاتی ہے اور ہمارا قلم اجازت نہیں دیتا کہ شرم و حیا سے گری ہوئی ان باتوں کو نقل کر کے مسلمانوں کے نامۂ اعمال کو مزید سیاہ بنا کر دکھلائیں - یہ دل آزار تحریریں مقدس نوشتوں کی طرح درسِ نظامی اور دورۂ حدیث کا خاص حصہ ہیں اور انہیں پڑھے بغیر نہ کوئی عالم کہلا سکتا ہے اور نہ ہی فاضل انہیات!——— کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اجرائے نبوت کے اصل مجرم خود مسلمان ہیں اسی طرح اہانتِ رسولؐ کی جزئیات بھی ان ہی کے عقیدے اور ایمان کا حصہ ہیں - لہٰذا آئندہ جب بھی تطہیر کا کوئی مرحلہ شروع کیا جائے تو روحِ قرآن، عصری تقاضوں اور نفسیاتِ وحی کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اس کے بغیر مفاسد کے دروازے تو کھل سکتے ہیں اصلاحِ احوال نہیں ہو سکتی - آپ مسلمان کی حیثیت سے قرآن پاک پر ایمان لانے کے مکلف ہیں اور قرآن ہی ایمانیات و عقائد کا تعین کرنے کا مجاز ہے - اِدھر اُدھر سے اینٹ گارا اکٹھا کر کے یقینیات کا محل تعمیر کرنا سود مند نہیں ہو سکتا -

آپ اہانتِ رسولؐ اور اجرائے نبوت کے متعفن مواد کو اگر جسدِ شریعت سے خارج کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن کو ایک بڑے آپریشن کے لئے پوری جرأت سے آمادہ کیجیئے - کیونکہ نشتر زنی سے چبھن ٹیس اور شدتِ الم کا احساس ناگزیر ہے پھر ایسا نہ ہو کہ آپ جراح کی پیشہ ورانہ مجبوری اور ماہرانہ صلاحیت کو بدنیتی پر محمول کر کے اس کے دشمن بن جائیں - اس طرح آپ صحت کو نہیں پا سکیں کیونکہ ہمارے ہاں ایسے بھی انتہا پسند ہیں جو قرآن کے حوالہ سے بات سنتے ہی الرجک ہو جاتے ہیں اس طرح وہ قرآن پاک کو تو نقصان نہیں پہنچا سکتے البتہ خیر و فیض کے بنیادی سرچشمے سے محروم رہ جاتے ہیں - وہ کسی غیر مسلم کی "اہانتوں" کا

احاطہ کیا کریں گے۔ اپنے دائرۂ اہانت کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے
____ ھمیں اعتراف ہے کہ احمدیوں نے مخصوص اصطلاحات کا آزادانہ
استعمال کرکے راسخ العقیدہ لوگوں کو مشتعل بھی کیا ہے اور اپنے دائرۂ کار کو
محدود بھی لیکن حق تو یہ ہے کہ یہاں بھی ہم نے پہل کی اور ہمارے ہی علماء وصوفیاء
نے مخصوص اصطلاحات کے کھلے بندوں استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کی وہ
اپنے بزرگوں کو رضی اللہ عنہ بھی کہتے رہے اور" والسلام علی ابی حنیفہ
واحبابہ" بھی لکھتے رہے (اصول الشاشی طبع نو ٹو مکتبہ امدادیہ ملتان ص۵ سطر ۴)
انہوں نے "رؤیائے صادقہ" مبشرات۔ بروز۔ کشف اور الہام جیسی نازک اور
حساس اصطلاحات کی اوٹ میں "نبوت" کے زندہ تقاضوں کو مجروح کرنے
کی جسارت بھی کی اور خدارسیدہ ومحترم لوگوں کی ازواج کو حرم۔ مادر ملت(۱) اور
نہ جانے کس کس تقدس کے غازوں سے روشناس بھی کرایا۔ انہوں نے بزرگوں
کے مزاروں پر بہشتی دروازے بنائے۔ مقابر کی طرف جانے والی گلیوں اور
مرشدوں کی ڈیوڑھیوں کو بہشتی گلیوں سے موسوم کرکے۔ اصطلاحات کی مٹی
پلید کی۔ مخصوص مقابر میں دفنائے جانے کو نجات کی حتمی ضمانت تصور کر لیا۔ مکہ، مدینہ
کربلا، نجف، کاظمین اور مشہد کے زیر زمین گڑھوں میں بھاری معاوضے دے کر
گویا بہشتی کھڑکیاں کھلوائی گئیں۔ قبر میں منکر نکیر(۲) کی گرززنی سے بچنے کے لئے
پیروں اور بزرگوں کی دستگیری کا اہتمام کیا گیا۔ اس طرح نامعلوم پورے دین
اور دینی اصطلاحات کو کیا کیا روپ اور کس کس شکل میں بدل کر رسولؐ۔ قرآن اور
اسلام کی بے پرہیزی کی حد تک توہین کی گئی ____ اور اس کے باوجود اصرار ہے کہ
وہ "اہانت" کے مرتکب ہوئے ہی نہیں بڑی ستم ظریفی ہے باشعور لوگ پہلے غلطی

(۱) اس کے معنے ہیں "ام المومنین" (۲) عذاب کے خیالی فرشتوں کے فرضی نام

کا اعتراف کرتے بعد میں اصلاحِ احوال کا سوچتے ہیں۔

اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں علماء کی آتشیں تصریحات کے | اور اہانتِ قرآن مطلوبِ مؤمن؟

ساتھ ساتھ اہانتِ قرآن کے بارے میں ان کی سرد مہری تعجب انگیز ہے وہ قرآنِ پاک کو۔ ابلاغ کے باب میں مکمل، مکتفی اور غیر محتاج تسلیم نہیں کرتے جب کہ اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان لانا رسول کی ذمہ داری ہے (البقرہ، ۲۸۵) یعنے رسول اس لئے رسول ہے کہ وہ حقیقتِ قرآن پر ایمان لایا ہے۔ اب سوچو کہ جس حقیقت پر ایمان لاکر رسول اپنی رسالت کو محفوظ کرلیتا ہے وہی قرآن اگر خود بھی کسی دوسری حقیقت کا مرہونِ منت، محتاج یا نتیجہ ہے تو اس سے بڑھ کر اس کی توہین کیا ہو سکتی ہے؟ ابن عبدالبر (۱۰۷۱م) اور شاطبی (۱۳۸۸م) نے امام عبدالرحمان اوزاعی (۷۷۴م) سے نقل کیا ہے کہ۔ الکتاب احوج

الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب

قرآن کلی طور پر حدیث کا محتاج ہے بلکہ محتاج تر ہے

(بحوالہ جامع بیان العلم طبع مصر ۲/۱۹۔ الموافقات طبع مصر جلد ۴/ ۸ د ۱۰)

یہاں " احوج " مبالغہ کا صیغہ ہے یعنے محتاج تر۔ جس طرح شیر خوار یا کمسن بچہ، پرورش، رضاعت، صفائی اور آرام کے لئے ماں کا محتاج ہے ماں اگر اسے سہارا نہ دے تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اسی طرح قرآن بھی حدیث کا محتاج ہے حدیث اگر سہارا نہ بنے تو قرآن کی " قرآنیت " بیکار ہو کر رہ جائے۔ یعنے علماء کی افتاد کے مطابق ایک سول کورٹ، پاور اور اتھارٹی کے لحاظ سے سپریم کورٹ پر فائق اور بالاتر ہے۔

غور فرمایئے ہمارے اسلاف جس قرآن کو مخلوق ماننے کے لئے تیار نہیں

اُسی قرآن کو مخلوق کے ماتحت کر کے اس کی بنیادی اہمیت ہی ختم کر بیٹھے کیا اب بھی وہ کہہ سکتے ہیں کہ۔ قرآن ہی ہر نوع کی رہنمائی کا سرچشمہ اور ایمانیات کا منبع ہے؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ۔ جہاں حقیقی اہانت کا وجود ہے وہاں یہ لوگ کیوں خاموش ہیں؟ (مزید ملاحظہ ہو عنوان "قرآن کیا رہنمائی کرتا ہے" ؟)

ہم نے اس خیال سے کہ اہانتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آڑ میں انسانی جان کا مسئلہ پیدا کیا گیا ہے تصویر کا دوسرا رخ دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ نیز یہ دکھلانا بھی پیشِ نظر تھا کہ اہانتِ قرآن اِن لوگوں کی تھیوری میں شامل ہے اور صدیاں گذرنے پر بھی یہ لوگ اپنے اسلاف کے ان ہی قرآن شکن اقوال کو پیش کر کے عملاً ثابت کرتے رہے ہیں کہ وہ قرآن کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں اس کے باوصف نہ تو اسلام بگڑے نہ ایمان جائے۔

حکمِ ارتداد کا دورِ واپسی

بلاشبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رحلت فرماتے ہی "ارتداد" کی لہر زور دار طریقے سے اٹھی اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی۔ ایسے میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نبوی بصیرت نے اُن خطرات کا بروقت احساس کیا جو نرم پالیسی کی وجہ سے عفریت بن کر جسدِ اسلام کو نگل جانا چاہتے تھے۔ بنا بریں یارِ غار نے اپنے وقت اور معروضی حالات کے مطابق مرتدوں کے خلاف جو اقدام کیا تھا وہ بصیرتِ صدیق کا شاہکار تھا لیکن اس کے بعد اسلام جب چہار دانگِ عالم میں پھیل گیا مسائل و احکام کا بستی بستی گاؤں گاؤں، جنگل جنگل اور صحرا صحرا میں مکمل طور پر تعارف ہوتا گیا تو ارتداد کو چھیڑنے کی پالیسی ترک کر دی گئی یا یہ کہ چھیڑنے کا جواز باقی نہ رہا۔ اس طرح ابوبکر کا جہاد اسباب و عوامل اور علتوں کے تابع تھا اسلام کی مستقل پالیسی نہیں تھی، مرتدین

اگر حملہ آور نہ ہوتے تو جنگِ یمامہ کے واقعات بھی پیش نہ آتے کیونکہ یہ قرآن ہی کا امتیاز ہے کہ وہ مخالفین و مرتدین کو عقیدے کی تبدیلی پر۔ دعوتِ مبارزت نہیں دیتا اب دنیا مانے یا نہ مانے کہ مسلمانوں نے پُرامن مرتدوں کے ساتھ کہیں انتہا پسندانہ اقدام کیا بھی ہے تو وہ ان کی اپنی ذمہ داری تھی۔ انہوں نے اللہ کے عطا کردہ پروانۂ امن کی ہتک کی۔ وحیِ الٰہی کے حکمِ امتناعی کو روند ڈالا اور اسلام کی رسوائی کا سامان کر گئے۔ ۱۸۲۴ھ میں ایک ارمنی مسلمان اپنے سابقہ مذہب پر واپس ہو گیا اس مرتد کی کے شیخ الاسلام نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا برطانوی سفیر (SIR STRAFEDFREE REDCLIFF) نے بہت بُرا منایا اور جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لئے تمام قرآن کا مطالعہ کر ڈالا اور جب ان کو قتلِ مرتد کے جواز میں کوئی آیت نظر نہ آئی تو اطمینان کر لیا اور خوش ہو کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور قرآن سے قتلِ مرتد کا حکم نہ پانے کی وضاحت کی سلطان کو یقین نہ آیا۔ اس نے شیخ الاسلام (اسلامی لاٹ پادری) سے دریافت کیا انہوں نے شد و مد سے انکار کیا اور کہا کہ۔ قرآن کا حکم بھی یہی ہے — لیکن شیخ الاسلام پر جب ان کی غلطی ظاہر کی گئی تو اہانت کے لہجہ میں کہا کہ ——

—— قرآن مذہبِ اسلام کے لئے کافی نہیں ہے فقہ اور حدیث بھی قرآن کا درجہ رکھتے ہیں(۱) —— بلکہ وحیِ الٰہی کسی مقام پر اگر فقہِ حنفی کے خلاف ہے تو منسوخ ہے یا قابلِ تاویل(۲) —— آخر شیخ الاسلام کے فتوے کے بموجب ارمنی کو قتل کر دیا گیا اور یوں اسلام اور قرآن۔ ملا کی نادانی کی بدولت رسوائی سے دوچار ہوئے۔ اور پھر اسلام کے نمائندوں یعنے ترکی حکومت کے حق میں کوئی

---

(۱) شیخ الاسلام کے یہ الفاظ دراصل یحییٰ بن کثیر، امام اوزاعی، امام کرخی و دیگر فقہا و محدثین کی آواز کی بازگشت تھے (۲) تاریخ الفقہ الاسلامی مصنفہ علامہ خضری اردو ترجمہ طبع دار المصنفین اعظم گڑھ صہ ۲۲۱ سطر نمبر ۱۲ تا ۱۳

نتیجہ بھی خوشگوار نہیں نکلا کیونکہ روس، جرمنی، فرانس اور انگلستان نے احتجاج بھی کیا اور ترکی کو الٹی میٹم بھی دے دیا کہ —— یا تو ایسا وحشیانہ حکم منسوخ کیا جائے یا پھر دوستانہ تعلقات ختم سمجھے جائیں؟ چنانچہ آئندہ کے لئے اس الٹی میٹم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیئس سال بعد ۱۸۴۳ء میں سلطان عبدالمجید خاں (۱۸۶۱ء) کے "ارادے" سے شریعت یا شیخ الاسلام کی زبان میں —— قرآن کے اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا (العیاذ باللہ) اور یہ اس لئے نہیں کہ ترکوں نے بعد میں "قرآن مجید" پڑھ کر اپنی غلطی کا احساس کر لیا تھا قرآن تو آج بھی اُن کے پاس سربمہر کتاب ہے بلکہ اس لئے ہوا کہ اب صنعتی یورپ جو منزلِ ارتقاء کی طرف رواں دواں تھا اس کے ردِ عمل اور بائیکاٹ کا اندیشہ تھا۔ تاہم شیخ الاسلاموں کا اثر اور گرفت اب بھی مضبوط تھی اور ان کے خود ساختہ اسلام سے —— بابِ عالی اب بھی مرعوب تھا —— کہ ۱۸۷۸ء[1] میں ایک بار پھر قتلِ مرتد کا سانحہ پیش آیا۔ یعنے حکومت نے ایک ترک کو انجیل کا ترجمہ کرنے کے جرم میں مرتد قرار دیا اور بحکم شیخ الاسلام اُسے قتل کر دیا گیا —— نتیجہ یہ کہ اس سے یورپ میں پھر اُبال آیا اور ترکی کو آئندہ ایسے عمل کے اعادے پر فوجی مداخلت کی دھمکی دے دی گئی —— یعنے کہ یورپ اگر طاقت ور اور نگہِ بلند نہ بن چکا ہوتا تو مسلمان حکمران اپنے شیخ الاسلاموں کے ذریعہ —— مذہبی وحشیانہ رسوم سے تا قیامت دست بردار نہ ہو سکتے تھے۔

اور یہ بات اس امت کے لئے کتنی باعثِ شرم ہے جس کی بنیادی تعلیمات میں انسان کے عقیدے اور ذات کا احترام شامل ہے —— بہرحال یورپ کے پے در پے سیاسی اور فوجی دباؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک وحشیانہ عمل اپنے منطقی انجام کو پہنچا یعنے ۱۸۴۴ء کے وحشیانہ قتل کے بعد حکمِ ارتداد کا

(۱) سلطان عبدالحمید دوم کے زمانے میں

دم واپسی شروع ہوا اور بہت سے مسلمان ملکوں سے "قتلِ مرتد کی رسم بد مٹ کر موت کی نیند سوگئی!

جگ ہنسائی کا تدارک

ہمارے ہاں صدیوں سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ ہماری مذہبی حکومتیں غیر مسلم شہریوں کو شہریت کے مساوی حقوق سے محروم کرتی آئی تھیں اور ہمیں باور کرایا جاتا تھا کہ جس طرح غیر مسلم اسلامی حکومت کے کل پرزے نہیں بن سکتے اسی طرح ان کے شہری حقوق بھی مساوی نہیں ہو سکتے۔ اسلام نے اگرچہ قصاص کا حکم دے کر مسلم اور غیر مسلم کے مابین دیوانی اور فوجداری قوانین کے امتیاز کو یکسر ختم کر دیا تھا مگر ہمارے علمائے نے ان تعلیمات کو ٹھکرا کر غیر مسلموں کے شہری حقوق کو پامال کرنا دینی فرض سمجھ رکھا تھا۔ لیکن آج ہم ماضی کی اس تنگ ظرفی پر نادم ہیں اور اب صدیوں سے رائج مذکورہ عدالتی قوانین سے عملاً کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ کیونکہ ہمارا یہ طرزِ عمل ہماری گروہی سیاست اور جانبدارانہ آئیڈیالوجی کی پیداوار تھا اور آج ہم اس سے دست کش ہو کر اپنے غیر انسانی احکام و ضوابط سے خود ہی ہاتھ کھینچ کر ایک ایسے عالمی معاشرے کا فرد بننے میں لگے ہوئے ہیں جس میں انصاف کو نہ تو مذہبی اور نسلی ترازو میں تولا جاتا ہے اور نہ ہی سچائیوں کو مخصوص گروہی سانچوں میں ڈھال کر اچھوتوں کا کردار ادا کیا جاتا ہے ـــــ اور اسی میں ہماری مسخ شدہ آئیڈیالوجی کی شکست کے واضح آثار پائے جاتے ہیں! (۱)

---

(۱) امام الہند۔ اقلیتوں کے حقوق کے ضمن میں اشارہ فرماتے ہیں کہ ـــــ انہیں پوری مذہبی آزادی ملے گی۔ ان کی مذہبی عبادت گاہیں اور ہر طرح کی مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی۔ صلیبوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا سنکھ بجانے سے نہیں روکے جائیں گے۔ اپنے تہواروں میں اپنے جلوس نکال سکیں گے۔ تمام مذہبی عہدے اور انتظام بدستور قائم رکھے جائیں گے۔ انہیں مذہب سے برگشتہ نہیں

باقی اگلے صفحہ پر

یہ تمام باتیں۔ میں اپنے جی سے عرض نہیں کر رہا۔ ہمارے بالغ نظر فقہا بھی بہت سی فقہی خامیوں کا احساس کرتے ہوئے " امت کی مصلحتوں " کے نام پہ بہت سی تبدیلیوں، ترمیموں اور نظر ثانی کے اشارے کرتے رہے ہیں۔ علامہ شاطبی (م ۱۳۸۹ھ)، امام کرخی (م ۱۵۹۸ھ) علامہ سرخسی (م ۱۰۹۰ھ) اور فقیہ اسلام نجم الدین طوفی (م ۱۳۱۶ھ) نے " فقہ اسلام کی باب بندی میں " ملی مصالح " کے تقاضوں کا بنیادی حیثیت سے اعتراف کیا ہے۔ یعنی " ملی مصالح " کی خاطر۔ اُن تمام حدود و قیود اور پابندیوں پہ نظر ثانی کرنے کا مشورہ دیا ہے جو کسی ہائی اتھارٹی کی جانب سے عائد کی گئی ہوں لیکن عرصہ دراز گذرنے پہ ان کی افادی اور اصلاحی حیثیت ختم ہو چکی ہو۔ نہ صرف ختم ہو چکی ہو سوسائٹی مفاد کے لئے ضرر رساں بھی ثابت ہو چکی ہوں۔

تفاصیل ملاحظہ ہوں

" الموافقات " مصنفہ علامہ شاطبی طبع مصر ۱۳۴۱ھ جلد ۲/۲/۹ تا ۱۳/ نیز جلد ۲/۲۰۱/۲ تا ۵

" الاحکام " مصنفہ آمدی طبع قاہرہ جلد ۶/۲۱۲

" المبسوط " تالیف۔ امام سرخسی طبع مصر جلد ۱/۱۴۵

" طوفی " بحوالہ " یسر الاسلام " مصنفہ علامہ رشید رضا طبع مصر ۱۹۲۸ء۔ المنار پریس قاہرہ ص ۷۲۔

" مجلہ المنار " ۹ ص ۷۴۵ و ص ۷۷۰۔

اس ضمن میں علامہ طوفی علیہ الرحمۃ کا شذرہ پیش خدمت ہے۔ فرماتے ہیں فاذا رأینا الشرع متقاعدا عن افادتہا علمنا اننا احلنا فی

کیا جائے گا۔ قانون کی نظر میں ان کی جان اور مال مسلمان کی جان اور مال کی طرح ہوگا۔ تجارتی کاروبار اور معیشت میں کسی طرح کی روک ٹوک نہ کی جائے گی۔ خلفائے اربعہ کی وصیت کا پہلا جملہ ہے " غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھنا کیونکہ ہم نے ان کا ذمہ لیا ہے "

(ایجدف تفصیل۔ مکالمات ابوالکلام ص ۲۱۵ تا ص ۲۱۷)

تحصیلها علی رعایتها

"ہم جب محسوس کریں کہ شریعت" (اور فقہی قوانین) ہماری ملی مصلحتوں کی تکمیل سے قاصر ہے اور اس کے تقاضے ہمارے جدید ملی شعور اور تقاضوں کا احترام نہیں کرتے تو ہمارے لئے روا ہو گا کہ ملی مصلحتوں" کے نام پر اس کی بے چارگی دفعات کو یہاں تک روند ڈالیں جس حد تک ہماری" ملی مصالح" متقاضی ہوں" ——— (بحوالہ یسر الاسلام ص۲۷)

فرمایئے اتنی وضاحت کے بعد ہمارے پاس قتل مرتد ——— دیت، قصاص، شہادت اور غیر مسلموں کے شہری حقوق کے بارے میں جانبدارانہ ۔ وحشیانہ اور غیر انسانی عمل کو اختیار کرنے کا جواز کیا رہ جاتا ہے ؟

میرا عقیدہ

میری گذارشات کی انتہا ہو گئی اب انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ آپ میری طرف میلی نظروں سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور حسنِ نظر سے بھی ۔ اگر لغزشوں اور خام کاریوں پر درگذر فرمادیں گے تو یہ آپ کی فراخ حوصلگی ہوگی اور اگر خوردہ گیری سے کام لیں گے تو بھی میرا ضمیر صاف ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے نیک نیتی سے لکھا ہے کوئی تلخ بات اگر تحریر کا جھومر بنی ہے تو حقائق" کا خمیر تلخیات" ہی سے اٹھتا ہے ۔ اور میرے نزدیک ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ———

——— دینِ اسلام مکمل ہو چکا ہے ۔ تکمیلِ دین کے لئے کسی نئے ظہور پر ایمان لانا شرطِ نجات نہیں ہے لہذا میں دو شہادتوں کا مکلف ہوں ایک لا الٰہ الا اللہ ——— دوسری محمد رسول اللہ ——— تیسری شہادت پر

نہیں جسے شرطِ نجات کے طور پر جزوِ "کلمہ" بنایا جاسکے۔ اور اگر کسی زمانے میں نئے ظہور (مہدی ہوں خواہ مسیح) پر ایمان لانا مسلمانوں کے لئے ضروری ہوتا تو اس کی وضاحت قرآنِ پاک میں کر دی جاتی کہ "ایمانیات" کا ماخذ صرف اور صرف قرآنِ پاک ہی ہے۔

والسلام

از رحمت اللہ طارق

19-3-87

ملتان

کتبہ: محمد عبد السلام ہاشمی ملتان

کتابیات

تفاسیر:- تفسیر القرآن سرسید احمد خان ــــ المنار مفتی محمد عبدہ ــــ تفسیر طبری
تفسیر رازی ــــ تفسیر آلوسی ــــ تفسیر ابن کثیر ــــ احکام القرآن ابوبکر ابن
العربی ــــ احکام القرآن ابوبکر الجصاص ــــ المصحف المفسر للوجدی ــــ
منسوخ القرآن- لراقمہ ــــ ترجمان القرآن امام الہند ــــ ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد

احادیث:- بخاری، مسلم، ابوداؤد ــــ دارقطنی ــــ دارمی ــــ المحلی
ابن حزم ــــ فتح الباری ــــ شرح مسلم نووی ــــ نصب الرایہ زیلعی ــــ

اصول:- المنار ابن القیم ــــ تاریخ الفقہ الاسلامی خضری بک ــــ حصول
المامول صدیق حسن ــــ ارشاد الفحول- شوکانی ــــ الفقہ علی المذاہب
الاربعۃ للجزیری ــــ نزہۃ النظر ابن حجر ــــ معرفۃ علوم الحدیث للحاکم
الکفایۃ للخطیب ــــ الرفع والتکمیل- عبدالحی فرنگی محلی ــــ مقدمہ فتح الباری
ابن حجر ــــ تدریب الراوی سیوطی ــــ الاحکام السلطانیہ للآمدی
یسر الاسلام رشید رضا ــــ المبسوط للسرخسی ــــ طبقات المدلسین
ابن حجر ــــ اصول الشاشی

عقائد:- القرآن الحکیم ــــ اصول الدین فخر الدین رازی ــــ الموافقات
للشاطبی ــــ الحریۃ الدینیہ عبدالمتعال صعیدی

تاریخ:- فتوح البلدان بلاذری ــــ الاعلام زرکلی ــــ کامل ابن اثیر
تذکرہ امام الہند آزاد ــــ

لغت و ادب: - اساس البلاغۃ زمخشری ـــــ مفردات راغب ـــــ
تاج العروس زبیدی ـــــ لغات القرآن پرویز ـــــ لطائف اللغۃ ـــــ
المنجد ـــــ المورد ـــــ محیط المحیط للبستانی ـــــ ثبات۔ ارشد ملتانی

رجال: - تقریب التہذیب ابن حجر ـــــ تہذیب التہذیب ابن حجر
لسان المیزان ابن حجر ـــــ میزان الاعتدال ذہبی ـــــ تہذیب الکمال
خزرجی ـــــ حلیۃ الاولیاء۔ اصفہانی ـــــ

فقہ: - الاعتبار للحازمی ـــــ مشکل الآثار طحاوی ـــــ جامع بیان العلم
ابن عبد البر ـــــ

مقالات: - مکالمات ابوالکلام ـــــ تحقیقاتی رپورٹ جسٹس منیر

جرائد و مجلات: - امن کراچی ـــــ طلوع اسلام کراچی
العربی کویت ـــــ زمیندار لاہور ـــــ نوائے وقت لاہور ـــــ
ملت لاہور ـــــ امروز لاہور ـــــ جنگ لاہور ـــــ

حرفِ دل

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم مسیحا رشک مے آرد بہ درمانے کہ من دارم

زکفرِ من چہ میخواہی زِ ایمانم چہ می پرسی ہماں یک جرعۂ عشق است ایمانے کہ من دارم

خدا دارم دِلِ بریاں زِ عشقِ مصطفےٰ دارم ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

زجبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمے خواہم ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

فلک یک مطلعِ خورشید دارد با ہمہ شوکت ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

زبرہاں تا بہ ایماں سنگہا دارد رہِ واعظ

ندارد ہیچ واعظ ہم چو برہانے کہ من دارم

سیّد احمد خاں علیہ الرحمۃ